نغمہ زار




یعنی

ابو الاثر حفیظ جالندھری

کی

نیچرل۔ مترنم نظموں۔ اور غزلوں کا مجموعہ

طبع اول سنہ ۱۹۲۵ء




طبع ثانی سنہ ۱۹۲۷ء

سول ایجنٹ مخزن بک ایجنسی بھاٹی گیٹ لاہور

طبع ثانی ۲۲۰۰

کتبہ صفدر علی رامپوری

نغمہ زار بموجب سرکلر 20428 ڈائرکٹر صاحب سررشتۂ تعلیم نے پنجاب بھر کی سکول لائبریریوں کے لئے منظور فرمائی ہے *

(گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپا)

فہرست مضامین



تہدیہ

طبعِ اول کے وقت میں نے نغمہ زار کو اپنے اُستاد حضرت مولانا گرامی کے نامِ نامی سے معنون کیا تھا۔ آج وہ جسمانی لحاظ سے دُنیا میں موجود نہیں۔ مگر اُن کی رُوح کا تعلّق مجھ سے اور میری شاعری سے بدستور موجود ہے۔ اس لئے میں نغمہ زار کو ہمیشہ کے لئے یادِ گرامی سے وابستہ کرتا ہوں +

حفیظ



دیباچۂ طبع ثانی





(از تاثیر ایم۔اے)

حفیظ کی شاعری اُمید افزا ابتدا سے تکمیل تک جا پہنچی مگر میرے دل میں جو جگہ نغمہ زار کی نظموں کے لئے ہے وہ کسی اَور نظم کے لئے نہیں ۔ نغمہ زار کے بعد حفیظ نے جو کچھ لکھا۔ وہ فن اور نفسِ مضمون کے اعتبار سے بلند تر اَور پُختہ تر ہے۔ متانت اور عُلوِّ تخیُّل لطافت الفاظ سے اس طرح ممتزج ہوئے ہیں۔ کہ ادبیات میں ان کا مقام جاودانی ہے۔ مگر جو سبک سیری جو فرحت فزائی[۱] نغمہ زار کے الفاظ معانی اور بحوریں ہے۔ وہ

[۱] حفیظ کے استعمال بحور و قوانی پر ایک مستقل مضمون درکار ہے۔ تاثیر

اَور کہیں نہیں ملتی۔ نغمہ زار حفیظ کا شباب ہے اور اس میں شباب کی جملہ خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اور جب تک اس عجوزۂ دہر پر شباب مسلّط ہے۔ اس کا سکّہ جواں ہمت دلوں پر جما رہے گا +

کسی ایک نظم یا غزل کو دیکھو وہی شباب کی سرشوری استغناء اور انانیت نظر آتی ہے + "کرشن کنھیّا"! اس نام سے کس قدر عقیدت وابستہ ہے۔ مگر شاعر نے اس عقیدت کو طوقِ گردن نہیں بنایا اور شاعرانہ سربلندی سے طرب و غنا کی مسرّتوں کی آرزو کی ہے :-

بُت خانے کے اندر
خود حُسن کا بُت گر
بُت بن گیا آ کر

وہ گوپیوں کے ساتھ ہاتھوں میں دئے ہاتھ
رقصاں ہوا برج ناتھ

بنسی میں جو لَے ہے
نشہ ہے نہ مے ہے
کچھ اَور ہی شَے ہے
اک روح ہے رقصاں اک کیف ہے لرزاں

آنا نہ اکیلے ہوں ساتھ وہ میلے
سکھیوں کے جھمیلے

ہر نظم شباب کی حسن آفرینی اور جدت پسندی کا نمونہ ہے۔ اور اس رُوحِ خیال کی ترجمانی کے لئے اسے

انداز بھی تازہ ملا ہے۔ نظم کی یہ صورت۔ یہ مسلسل قطرہ زنی جو سیلابِ موّاج سے زیادہ سنگ فرسا ہے اپنے ساتھ ایک اپنا مخصوص ترنّم لائی ہے +

شعر اور نغمے کا تعلّق تو شاعری کے مظہر یعنی الفاظ سے ظاہر ہے + الفاظ کیا ہیں ؟ اصوات ! ایسی آوازیں جن کی مختلف ترکیبوں میں مختلف لوگوں نے مختلف معنی ڈال دئے ہیں + شاعری کیا ہے ؟ بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب۔ اور نغمہ کیا ہے ؟ بہترین اصوات کا مجموعہ ! یہی وجہ ہے۔ کہ مشاہیر شعرا اپنے شاہکار روزمرّہ کے سوقیانہ تجارتی لہجے کو ترک کرکے لےَ میں پڑھتے ہیں + اگر ایران کا عارف قزوینی بربط لے کر اپنی "تصنیف" گاتا پھرتا ہے۔ تو زبورِ عجم کا مصنّف "آسا کی دُھن" میں سامعین کے قلوب پر شعلہ ریز ہوتا ہے۔ شعرا اپنے اپنے

ترنّم پر ناز کرتے ہیں۔ اور حافظ تو موسیقی کی دیوی ناہید
سے صف آرا ہو جاتا ہے ؎

غزل سرائیِ ناہید صرفہ نبرد
در آں مقام کہ حافظ برآورد آواز

شاعری تو اپنے مظہرِ صوتی یعنی الفاظ کی وجہ سے موسیقی سے
ہم آہنگ ہے۔ مگر یورپ کی جدید مصوری کے مدرسے
تصویر کشی کو بھی موسیقی سے مماثل کرنا چاہتے ہیں + وسلر کی
تصاویر کے نام "آہنگِ ارزق" "نغمۂ زرد" مشہورِ عوام
ہیں + غرض شاعری اور نغمے میں اگر فرق ہے تو شراب
اور شیشے کا۔ اور شرابِ صافی اور شیشۂ شفّاف کا فرق
ایک عرب شاعر یوں بیان کرتا ہے ؎

رقّ الزّجاج ورقّت الخمر
فتشابہا وتشاکل الامر

فکانّما خمر ولا قدح
وکانّما قدح ولا خمر

(شفّاف ساغر اور صاف شراب نے امتیاز

دُشوار کر دیا ہے۔ کبھی یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ شراب ہے اور قدح نہیں کبھی یہ کہ قدح ہے اور شراب نہیں)

حفیظ کا مروّجہ طرز اس قدر مقبول ہؤا ہے۔ کہ اسے اب مقبولیت کی مضرتیں بھی لاحق ہو گئی ہیں۔ حاسدین کہ زندگی کی دوڑ میں اُن کا ہونا ضروری ہے اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں کہ شاعر کی ہمّت کو مہمیز کر دیں۔ مگر خطرناک وہ مخلص خوشامدی ہیں جنہوں نے اپنی ستائش کو تتبع کے انداز میں پیش کیا ہے + شاعری اور پھر ایسی لطیف مترنم شاعری کے لئے فطری مناسبت درکار ہے۔ ورنہ آواز تو کوئل اور مینڈک بلبل اور جھینگر سبھی نکالتے ہیں!

مجھے ڈر ہے۔ کہ تتبع کا یہ طوفانِ بدتمیزی کچھ عرصہ کے لئے اصل کے اوصاف کو بھی نہ چھپا لے +

"شباب اور نغمہ"! یہ ہے حفیظ کے اس دَورِ اول کی

خصوصیت جس کی بنا پر میں "نغمہ زار" کو "نغمۂ شباب" کہا کرتا ہوں + غالباً اس طرزِ خیال کی بہترین ترجمانی "ابھی تو میں جوان ہوں" کا گیت ہے:-

یہ آسمان یہ زمیں
نظارہ ہائے دلنشیں
انہیں حیات آفریں
بھلا میں چھوڑ دوں یہیں ؟
ہے موت اس قدر قریں　　　مجھے نہ آئے گا یقیں
نہیں نہیں ابھی نہیں
ابھی تو میں جوان ہوں

شباب ہر جگہ اپنا نقطۂ نظر۔ اپنا طرزِ خیال پیش کرتا ہے۔ یہ "انانیت" نظم سے گزر کر غزل میں بھی نظر آتی ہے اور حفیظ میں یہ Personal touch اس قدر نمایاں ہے کہ

جہاں کہیں ردیف "میں" یا "مجھے" ہوتی ہے غزل کی سطح بہت بلند ہو جاتی ہے :-

لے جاؤ ساتھ ہوش کو اے اہلِ ہوش جاؤ
ہے خوب اپنی بے خبری کی خبر مجھے

ناآشنا ہیں رتبۂ دیوانگی سے دوست
کم بخت جانتے نہیں کیا ہو گیا ہوں میں
قائم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو
دُنیا سمجھ رہی ہے فنا ہو گیا ہوں میں
اُٹھا ہوں اک جہانِ خموشی لئے ہوئے
ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا ہو گیا ہوں میں

(تازہ غزل)

مطلب پرست دوست نہ آئے فریب میں
بیٹھا رہا لیئے ہوئے دامِ وفا کو میں

(تازہ غزل)

سیال جذبات کو اپنے من کی موج سے مختلف صورتوں میں ڈھال لینا مقابلتاً سہل ہے۔ مگر یہ "خود نظری" نیچر کے جامد جسم کو بھی اپنی مرضی کے مطابق موڑ لیتی ہے۔ "بسنت" ایک موسم ہے۔ جو ابتدائے آفرینش سے یکساں خصوصیات کے ساتھ آتا جاتا رہتا ہے۔ مگر حفیظ اس میں خوشی اور غم دونوں قسم کے جذبات بھر دیتا ہے اور آخری بند تو گویا بسنت کا ایک مستقل مجازی نشان (Symbol) بن گیا ہے:۔

اک نازنیں نے پہنے پھولوں کے زرد گہنے
ہے مگر اُداس

نہیں پی کے پاس
غم و رنج و یاس
دل کو پڑے ہیں سہنے اک نازنیں نے پہنے
پھولوں کے زرد گہنے

غزل کا شعر ہے :-

غنچہ غنچہ خوف سے مجھ کو نظر آیا قفس
پتّے پتّے پر ہوا دھوکا کفِ صیّاد کا

مگر شباب خود نظری کی اس کاوش سے بہت جلد تنگ آجاتا ہے۔ اور فکر کے بوجھ سے آزاد ہو کر مناظر کی رو میں بہنے لگتا ہے۔ "منظر کشی" مصوّری میں ہو یا شاعری میں شباب کا آزاد مشغلہ ہے۔ اور خالص مسرّت کا بہترین

نمونہ۔ اُردو شاعری کے اس نئے دَوْر میں یہ شعبہ بہت سے یورپ زدہ شعرا کا تختۂ مشق بنا رہا ہے۔ مگر تکلّف اور جبر منظر کشی میں بالخصوص سخت نازیبا ہیں۔ اس میدان میں بھی حفیظ جملہ معاصرین سے آگے نکل گیا ہے:۔

نمودِ سحر

یکایک ایک نُور کا غبار شرق سے اُٹھا
جو رفتہ رفتہ بڑھ چلا
اور آسماں پہ چھا گیا
حسینۂ نمود نے سیہ نقاب اُٹھا دیا
فسوں گرِ شہود نے طلسمِ شب مٹا دیا
یکایک ایک تازگی
یکایک ایک روشنی
نگاہِ جاں میں آگئی حیات میں سما گئی

یکایک ایک نور کا غبار شرق سے اُٹھا

یہ بندٹیپ کے صحیح استعمال کا ایک اعلےٰ نمونہ ہے اسلوب ایسا تازہ ہے۔ کہ ٹیپ پر تکرار کا شبہ نہیں ہوتا +

اشنان

کنارِ گنگ برہمن جوان و پیر مرد و زن

چڑھا کے دیوتا کو جَل

وہ جُھک رہے ہیں سر کے بَل

وہ ساریوں کو باندھ کر نہا رہے ہیں گلبدن

بروئے آب سر بسر کِھلا ہوا ہے اک چمن

....

....

جھُولا

آموں کے نیچے ڈالے ہیں جھُولے

مہ پیکروں نے ۔ سیمیں تنوں نے ۔ برق افگنوں نے

....

"برق افگنوں" کی ترکیب نے گویا ساکن جھُولوں کی پینگیں آسمان پر ڈال دی ہیں +

"رکھوالا لڑکا" "شب زاد نظارے" اور ایسے متعدد نقشے اُردو شاعری کا مستقل جزو بن چکے ہیں +

مگر یہ نیچرل شاعری محض "حواسِ خمسہ" کی شاعری ہے ۔ اور یہ ظاہری حواس بذاتِ خود دیرپا اور عمیق نہیں ہوتے ۔ اُردو شاعری میں یہ طرز انگریزی کے تتبع میں مروّج ہوُا مگر حفیظ اس پابندی سے بھی آزاد ہے اور اس کے مواخذ (اگر شاعری جیسی بدیہی چیز میں ان کا ہونا ممکن ہے) یا

رجحانات خالص ایشیائی ہیں۔ آزاد مرحوم جنہوں نے غالباً سب سے اول اس صنف کو کامیابی سے ترویج دی محض "اجزا شماری" کرتے ہیں اور منظر کشی میں حواسِ خمسہ کی بجائے عموماً ایک حسِ بصارت ہی کو استعمال کرتے ہیں۔ اور عام اُردو شاعروں کا یہی دستور ہے +

حفیظ "منظر کشی" میں عرب اور ایرانی شعرا کے راستہ پر چلتا ہے۔ اس کا مقصد فقط نباتات و جمادات کا گنوانا نہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے آزادانہ دیکھتا ہے اور دوسروں کی آنکھوں کے سامنے۔ ظاہری اور دل کی آنکھوں کے سامنے۔ ایک غیر فانی نقشہ پیش کرتا ہے جس میں جذبات اور حواس سب کا امتزاج ہوتا ہے۔ یہی آزادنگاہی ہی جو اسے یورپ زدہ شعراء سے ممتاز کرتی ہے + تم ان لوگوں کو چھوڑ دو جو نیچرل شاعری کو محض اس لئے صلا دیتے ہیں کہ

یورپ اسے پسند کرتا ہے۔ اور ان کو بھی جو اپنی بےبسی پر
تقلیدِ مغرب سے تنفر کا پردہ ڈالتے ہیں۔ ان تعصبات
سے بالا ہو کر دیکھو۔ کہ نیچرل شاعری کا اصلی مقصد کیا ہے۔
اور کیا حفیظ اس مقصد میں کامیاب ہے ؟

امرءالقیس کو لو کہ حواسِ ظاہری کا استعمال اس سے
زیادہ خوبی سے اور کون کر سکتا تھا ؟ برسات کا سماں
دکھاتے ہوئے کہتا ہے :۔

کَاَنَّ ثَبِیْرًا فِیْ عَرَانِیْنِ وَبْلِہٖ   کَبِیْرُ اُنَاسٍ فِیْ بِجَادٍ مُزَمَّلٖ

موسلا دھار بارش میں کوہِ ثبیر یوں نظر آتا تھا جیسے
کوئی بوڑھا سفید دھاری والا سیاہ کمبل اوڑھے ہوئے
کھڑا ہو ۔

عتابی کہتا ہے :۔

والغیمُ کالثوب فی الآفاق منتشرٌ

یعنی گھٹا اس طرح ہے جیسے کوئی کپڑا تنا ہوا ہو۔ پھر کہتا ہے۔ کہ یہ کپڑا بظاہر بالکل ٹھوس معلوم ہوتا ہے لیکن دھاریں بہنے لگیں تو خیال ہوتا ہے۔ کہ اس میں سوراخ ہو گئے ہیں اور گرجنے لگے تو کہو گے کہ "وہ پھٹا" اور اگر بجلی چمکے تو کہو کپڑے میں آگ لگ گئی +

یہ تو تھے کھلی ہوا میں رہنے والے عرب جنہیں مناظرِ قدرت سے خاص دلبستگی تھی۔ ایرانی شعرا کا انداز دیکھو:

فارسی شاعری کے ابوالآباء رودکی کی غزل سنو:-

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی   یادِ یارِ مہرباں آید ہمی

ریگِ آمودر شتیہائے او   زیرِ پایم پرنیاں آید ہمی

کہتے ہیں رودکی نابینا تھا اور گویا تھا شاید یہی وجہ تھی۔ کہ ہمارے شعرا کے خلاف وہ بصارت کے علاوہ قوتِ لامسہ سامعہ و شامہ کو بھی استعمال کرتا ہے۔ پہلے شعر میں مولیاں

کی بُو کی یاد ہے۔ اور دوسرے میں آمو دریا کی ریگ
کے لمس کا تذکرہ ہے !

منوچہری کہ نیچرل شاعری کا باوا آدم ہے ایک مرغ
آبی کی آزادی کا نقشہ کھینچتا ہے :۔

بر ساعتکی بط سخنے چند بگوید — در آب جهد جامه دگر بار بشوید
در آب کند گردن و در آب بروید — گوئی که مگر چیز کسے در آب بجوید

چوں سینہ بجنباند و یک لخت بپوید
از ہر سر پرّش بجہد صد دُرِ شہوار

بط پانی کی سطح پر تیرتی پھرتی دکھلائی دیتی ہے !

متاخرین شعرائے قاچار میں قاآنی اس صنف کا اُستاد سمجھا جاتا
ہے۔ لیکن میرے خیال میں وہ واقعہ بندی کا اُستاد
ضرور ہے۔ مگر منظر کشی کی حقیقت سے ناواقف ہے۔ اس کا
وہ مشہور بہاریہ قصیدہ لے لو۔ جو اس نے میرزا تقی خاں

کی شان میں لکھا ہے۔ تم دیکھو گے۔ کہ عبارت کی روانی لغت کی وسعت۔ محاکات کی درستی غرض شاعری کے حسن کا بہترین نمونہ موجود ہے "ہر شعر ایک مستقل تصویر ہے"۔ مگر تمام اشعار مل کر ایک متحد منظر پیش نہیں کرتے۔ اور ایک شعر دوسرے شعر پر کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ قاآنی جملہ حواسِ خمسہ کو استعمال کرتا ہے۔ مگر ان سب کو ممتزج کرکے ایک متوازن نقشہ نہیں بناتا۔

نسیمِ خلد می وزد مگر ز جوئبارہا　　　　که بوئے مشک می دہد ہوائے مرغزارہا

....

ز نائے خویش فاختہ دو صد اصول ساختہ　　　　ترا نہا نواختہ چو زیر و بمِ تارہا

دیکھو فاختہ۔ ساختہ اور نواختہ کے اندرونی قوافی کس قدر مترنم ہیں۔ اگلے شعر میں یہ اثر اور بھی تیز ہوجاتا ہے

....

زریزشِ سحابہا برآبہا حبابہا — چو جوئے نقرہ آبہا رواں آبشارہا

....

....

جوئبار کی ہوائیں اور مرغزار کی خوشبو۔ طیور کی صدائیں اور حبابِ آبجو کے نقشے خوب ہیں۔ مگر ان طویل جزئیات کے بعد پھر وہی ؎

فرازِ سروِ بوستاں نشستہ اند قمریاں

چو مقربانِ نغز خواں بزمر دیں منارہا

اس کی تشبیہات بھی کئی دفعہ محض بے جان رسمی صفات کا اعادہ ہوتی ہیں۔ مثلاً ابوالمظفر محمد شاہ کی مدح میں لکھتا ہے :۔

از سبزہ چمن چو روضۂ رضواں

از لالہ دمن چو سینۂ سینا

حضرت علی بن موسی الرضاؑ کی مدح میں :-

زفیض لالۂ و سوسن ز نور نور و نسترون

دمن چو وادیِ ایمن چمن چو سینۂ سینا

نہایت اچھے الفاظ ہیں مگر حاصل کچھ بھی نہیں +

قدیم اُردو شعرا نے بھی اس فرسودہ طرز کا تتبع کیا +

سوداؔ کا پیش کردہ منظر دیکھئے :-

اُٹھ گیا بہمن و دی کا چمنستاں سے عمل

تیغ اردی نے کیا مُلکِ خزاں مستاصل

تار بارش میں پروتے ہیں گُہر ہائے تگرگ

ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

عکسِ گلبن یہ زمیں پر ہے کہ جس کے آگے

کارِ نقاشیِ مانی ہے دوم وہ اوّل

اسی پر محسنؔ کاکوروی لکھتا ہے :-

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

دونوں قصیدے مُردہ الفاظ کے چنگیزی مینا رہیں
البتہ محسنؔ کہیں کہیں عربی تشبیہات سے تازگی پیدا کر دیتا ہے۔
ذوقؔ کے قصیدے بھی اسی قماش کے ہیں ؎

یہ آیا جوش پہ بارانِ رحمتِ باری
کہ سنگ سنگ میں ہے سنگِ دیدہ کی تاثیر

مرزا غالبؔ بھی اُردو میں حُسنِ تعلیل تک ہی پہنچتے ہیں :-

؎ سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

اس بحث سے میرا مقصد یہ تھا۔ کہ قدیم ایرانی و عرب شعرا کے بعد ایشیائی شاعری سے صحیح منظر کشی مفقود ہو گئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی۔ کہ بادیہ نشینی پر شہری تہذیب نے غلبہ پا لیا +

اسی سبب سے جب لاہور کے مشاعروں میں آزاد مرحوم نے اُردو شاعری میں ایک نئی روح پھونکنی چاہی تو ان کے سامنے فقط ہول رائڈ صاحب کے بتائے ہوئے سطحی اصول تھے اور بس +

جب حفیظ اس قسم کے اصول سے آزاد ہو کر اس میدان میں اُترا تو اس کی حالت بعینہٖ اُن قدیم شعرا کی طرح تھی جو اپنے لئے خود مشعلِ راہ تھے۔ اور ادبی روایات کی بجائے محض اپنے حواسِ خمسہ کی پیروی کرتے تھے +

حفیظ کے مناظر اس کی آزاد نگہی پر دال ہیں +

عتابی کی تشبیہہ "الفیم کا لثوب" اور ابو تمام کی مشہور "قوس قزح" :-

کاذیال خودٍ اقبلتَ فی غلائلٍ

مصبغۃٍ وَالبعض اقصر من بعض

یعنی قوس قزح کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی دوشیزہ رنگ برنگ کے باریک کپڑے پہن کر نکل آئی ہے اور ہر کپڑا دوسرے سے چھوٹا اور اونچا ہے ــــ یہ اسی آزادنگی کے شاہکار ہیں۔ حفیظ متقدمین سے رتبے میں بہت کم سہی مگر اس کا زاویۂ نگاہ وہی ہے ؏

"شام" کے ایک منظر میں حفیظ لکھتا ہے :-

کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو

پھیلا دیا فلک پر گوٹے کناریوں کو

۔ کیسی اچھوتی تشبیہہ ہے اور اس لحاظ سے کہ اس کے بعد

پنگھٹ کے جمگھٹوں کا نقشہ ہے۔ کس قدر مناسب ہے!

شام کے سیاہ اور سُرخ رنگ ہر شاعر کی نظر میں ہوتے ہیں لیکن اُردو شاعری کی کم مائگی اور "ڈگر پرستی" کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو گی کہ "نیلگوں سُرخی" کا سا بیش بہا افتادہ مضمون فقط حفیظ ہی کو سُوجھا ہے اس کی وجہ وہی آزاد نگہی! ایک اور نظم میں شام کے متعلق لکھتا ہے:-

وہ شفق کے بادلوں میں نیلگوں سُرخی کا رنگ
اور راوی کی سُنہری نقرئی لہروں میں جنگ

یہی "شام" کا مضمون کسی اور جگہ یوں بندھا ہے:-

بن گیا ہے آسماں نتھرے ہوئے پانی کی جھیل
یا کسی ساحر نے ساکن کر دیا دریائے نیل

یہ شام لبِ دریا کی شام ہے۔ اس لئے تشبیہہ بھی اسی انداز کی ہے!

"تاروں بھری رات" میں جھیل کو "ضوریز قندیل" لکھا ہے۔ مگر بڑھتی ہوئی تاریکی کا بہترین نقشہ ایک تازہ نظم میں ہے۔ ہر تشبیہہ اچھوتی اور "مصور" ہے!!۔

شام آئی ہے سکوں کے جال پھیلائے ہوئے ساحرہ بیٹھی ہے کالے بال بکھرائے ہوئے

اس طرح اونچے پہاڑوں میں گھری ہیں وادیاں جس طرح دیووں کے گھر میں قید ہوں شہزادیاں

جھاڑیاں کالی ردائیں اوڑھ کر چُپ ہو گئیں بند کلیاں اپنی خوشبو سے لپٹ کر سو گئیں

بے زباں خاموشیاں جاگیں صدائیں سو گئیں شورشیں چُپ ہو گئیں خاموشیوں میں کھو گئیں

دیکھو۔ ایک ہی مضمون کو کس قدر تنوع اور تازگی سے پیش کیا ہے ✦

مگر شاعر ایک سچا شاعر ان ظاہری حواس کے تاثرات سے دیر تک مطمئن نہیں رہ سکتا۔ حفیظ پہلے ہی ان سطحی مناظر سے عمیق جذبات کو ملا دیتا ہے۔ اور "نغمہ زار" کے بعد کی نظمیں تو تمام تر اسی راہ کے ارتقائی مراحل ہیں ✦

تاثیر

مکرر آنکہ ــــ نیچرل شاعری کے سلسلے میں حفیظ کی ایک اور خصوصیت قابلِ ذکر ہے۔ جو ہمعصر شعرا میں نادر نہیں بلکہ معدوم ہے۔ یہ "لوکل کلر"۔ مقامی رنگ۔ ہے۔ مناظرِ قدرت کی نقل ہی میں نہیں بلکہ ان کے جذباتی ماحول میں بھی اس کا استعمال نمایاں ہے۔ "طوفانی کشتی" پانچ دریاؤں کے مُلک کا کس قدر سچّا ڈرامہ ہے! ــ اسی طرح پنجاب کی دیہاتی زندگی کے اور بہت سے نقشے جابجا نظر آتے ہیں +

تاثیر





ارشادِ گرامی

فخرِ ایشیا ملک الشعرا حضرت اُستادِ مکرم مولانا شیخ غلام قادر صاحب گرامی قدس سرہٗ نے ذیل کے اشعار آبدار اس عاجز کے کلام کے متعلق ارشاد فرما کر ذرّے کو آفتاب بنا دیا۔ ورنہ من آنم کہ من دانم ان اشعار کو پڑھتا ہوں اور شرمندہ ہوتا ہوں۔ کہ کہاں گرامی شہنشاہِ اقلیمِ سخن اور کہاں حفیظ گدائے گوشہ نشین اور عامیِ کج مج زباں۔ لیکن گرامی کی نسبت نے اس کو گرامی کر دیا ؎

گرچہ خوردیم نسبتے ست بزرگ　　ذرّۂ آفتاب تابانیم

(حفیظ)

فصاحت مجسم بلاغت مصوّر　　کلامِ حفیظ ست اللہ اکبر
معانی دلآویز و الفاظ دلکش　　کلامِ حفیظ ست یا سلکِ گوہر

معانی در آغوشِ الفاظ پنہاں | بآب ست ماہی بآتش سمندر
معانی در الفاظ پنہان و پیدا | بہم کردہ فکرش مگر شیر و شکر
فصیحِ معظم بلیغِ مکرّم | حفیظِ سخن گو حفیظ سخنور
بہ فہرستِ معنی ست نامش مقدّم | بہ بزمِ گرامی کلامش مؤخر
حفیظِ مرا نکتہ سالک شناسد | بود این و آں ذرّہ و سالک اختر
چہ نسبت بود داغ را با حفیظم | مؤخر مقدم مقدّم مؤخر
بطرزِ آفرینیِ طبعِ بلندش | بود آسماں کارگاہِ محقّر
گرامی سحر گفت سالک[1] بگوشم
زبانِ حفیظ ست یا موجِ کوثر

[1] جناب سالک بٹالوی سے مراد ہے





دیباچہ طبع اوّل

جالندھر کے نغمہ پرور شہر نے "حفیظ" نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے۔ جو کچھ عرصے سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے۔ جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی

ہیں اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں ؛

ساون رُت گھنگھور گھٹاؤں میں کھیلتی ہوئی بجلی، موروں کی جھنکار۔ پپیہوں کی پکار۔ برسات کی ٹھنڈی ہوا۔ ہوا میں اُڑتے ہوئے آنچل۔ آنکھوں میں تمنائے دید اور فراق کے آنسو۔ دل کو انتظار کی دھڑکن۔ یہ ایک مستِ کیف شاعر کی وہ دُنیا ہے جس میں حفیظ گاتا پھرتا ہے۔ جب اس کا دل بھر آتا ہے۔ تو وہ آنسو بہا دیتا ہے۔ جب اس کے دل میں ایک ہُوک اٹھتی ہے۔ تو وہ اونچے سُروں میں الاپتا ہے۔ اور سُننے والوں کا کلیجہ مسل دیتا ہے ؛

یہ اس کے کلام کا مجموعہ ہے۔ چند ورق ہیں خُشک طبیعتوں کو جابجا اس میں "فن" کے نقائص اور بے عنانیاں نظر آئیں گی۔ اہلِ ذوق دیکھیں گے اور جائیں گے۔ کہ ایک وارفتہ

عاشق مزاج عشق کے اتھاہ سمندر میں خود بھی کس طرح ڈگمگاتا ہے۔ اور دوسروں کے دل بھی کس طرح ہلاتا ہے۔ حفیظ ایک ایسا شاعر ہے۔ جس کے قدم پامال رستے سے ادھر اُدھر جا پڑتے ہیں لیکن یہ ایک راہ گم کردہ کی آوارگی نہیں۔ ایک مست کی لغزشیں ہیں۔ نشے میں چور۔ کیف میں سرشار۔ جو پیتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔ پیالے میں بھی بھر دیتا ہے۔ اور یوں بھی لنڈھاتا ہے۔ ایک آزاد جوگا تا ہے۔ اور الفاظ اُس کی زبان پر ناچتے ہیں +

ہمارے شاعر برسوں سے تُرکِ شیرازی پرستی ہیں۔ ایک ایسی شرابِ طہور سے بے خود ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں۔ جو نہ خود پی سکتے ہیں۔ نہ اَوروں کو پلا سکتے ہیں۔ شاعری ایک فریب ہے۔ لیکن اس تصنّع کا کیا نام ہے۔ جو کسی کو دھوکا نہ دے سکے؟

حفیظؔ کی نظر ہندوستان کی دُلھن پر ہے۔ اور وہ اس جھلک پر فدا ہے۔ جو باریک آنچل میں سے دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ابھی وہ ترکِ شیرازی کی غلامی سے بالکل آزاد نہیں ہوًا۔ اور اُس کو کنکھیوں سے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے۔ یہ بے وفائی آخر کب تک؟ عاشق کہ نظر باز؟

پطرسؔ





ترنم



جوشِ عقیدت

خامہ انوار فشاں مدحِ شہنشاہ میں ہے
برقِ ایمن کا اثر ایک پرِ کاہ میں ہے
طورِ مشعل لئے ہر ہر قدم اس راہ میں ہے
کبھی خورشید میں ہے فکر کبھی ماہ میں ہے
جی میں آتی ہے کہ ہر ذرّے کو موسیٰ کر دوں
آنکھ جس کوہ پہ ڈالوں اُسے سینا کر دوں

بادۂ صدق سے لبریز ہے مینائے سخن
چھلکی پڑتی ہے مرے جام سے صہبائے سخن
ضَو فگن سینے میں ہے طُورِ تجلائے سخن
آج خود محوِ تماشا ہے تماشائے سخن

کس کے دربار میں مصروفِ عقیدت ہوں میں؟
بسکہ غوطہ زنِ بحرِ محبّت ہوں میں

کس کے پرتَو سے پُرانوار ہے چہرا میرا
کہ تماشائی ہے ہر دیدۂ بینا میرا
جس کو دیکھو وہ ہے بےتابِ تماشا میرا
جانے کیا دیکھتا ہے دیکھنے والا میرا!

عشق بھی حُسن ہے۔ ایسا نظر آتا ہے مجھے
پسِ پردہ کوئی بیٹھا نظر آتا ہے مجھے

جلوۂ سحر

تمامِ ملکِ ہست پر بُلند اور پست پر
قلمروِ حیات پر
تمام کائنات پر
خموشیوں کا ہے چلن سکوت حکمران ہے
فسونِ مرگ سکّہ زن حیات بے نشان ہے
وہ جوشِ زندگی نہیں
ہنسی نہیں خوشی نہیں
وجود بے وجود ہے جمود ہی جمود ہے
تمامِ ملکِ ہست پر بلند اور پست پر

خموشیوں کا راج ہے نہ تخت ہے نہ تاج ہے

امیرِ کج کلاہ چُپ

فقیرِ خانقاہ چُپ

ہوئے خوشی سے ہم بغل الم نصیب نیند میں

بنے ہیں صاحبِ دول کئی غریب نیند میں

نہ حسرتیں نہ خواہشیں

نہ محنتیں نہ کاہشیں

نہ رنجشیں نہ اُلفتیں مسرّتیں نہ کُلفتیں

خموشیوں کا راج ہے نہ تخت ہے نہ تاج ہے

فلک پہ ایک کارواں کہاں سے آگیا کہاں

کوئی صدائے پا نہیں

جرس نہیں درا نہیں

مسافرانِ شب مگر تھکن سے چور ہو گئے
نہ ختم ہو سکا سفر تو چلتے چلتے سو گئے
یہ انجمن کی انجمن
ہے خامشی میں غوطہ زن
سرود اس کی خامشی سفر نصیب زندگی
فلک پہ ایک کارواں کہاں سے آ گیا کہاں

یکایک ایک نور کا غبار شرق سے اٹھا
جو رفتہ رفتہ بڑھ چلا
اور آسماں پہ چھا گیا
حسینۂ نمود نے یہ نقاب اٹھا دیا
فسوں گرِ شہود نے طلسمِ شب مٹا دیا
یکایک ایک تازگی

یکایک ایک روشنی

نگاہِ جاں میں آگئی   حیات میں سما گئی
یکایک ایک نور کا   غبارہ شرق سے اُٹھا

چلا ستارۂ سحر   سُنا کے صبح کی خبر
زمیں پہ نور چھا گیا
فلک پہ رنگ آگیا
تمام زادگانِ شب   چمک چمک کے سو گئے
شرارِ آسمانِ شب   دمک دمک کے سو گئے
ستارے زرد ہو چکے
چراغ سرد ہو چکے
وہ ٹمٹما کے رہ گئے   یہ جھلملا کے رہ گئے
چلا ستارۂ سحر   سُنا کے صبح کی خبر

عبادتوں کے در کھلے　　سعادتوں کے گھر کھلے
درِ قبول وا ہوا
دعا کا وقت آگیا
اذان کی صدا اُٹھی　　جگا دیا نماز کو
چلی ہے اُٹھ کے بندگی　　لئے ہوئے نیاز کو
صنم کدہ بھی کھُل گیا
بپا ہے شور سنکھ کا
اُٹھو پجاریو اُٹھو　　چلو نمازیو چلو
عبادتوں کے در کھُلے　　سعادتوں کے گھر کھُلے

کسان اُٹھ کھڑے ہوئے　　مویشیوں کو لے چلے
کہیں مزے میں آگئے
تو کوئی تان اُڑا گئے

یہ سرد شبنمی ہوا　　یہ صحت آفریں سماں
یہ فرش سبز گھاس کا　　یہ دل فریب آسماں
بسے ہوئے ہیں پریت میں
ہیں محو ان کے گیت میں
کہاں ہیں شہر کے مکیں؟　　وہ بے نصیب اُٹھے نہیں!
کسان اُٹھ کھڑے ہوئے　　مویشیوں کو لے چلے

کھلا وہ حجلۂ سحر　　ہوا وہ حسن جلوہ گر
وہ مسکرا کے اک کرن
ہوئی اُفق پہ خندہ زن
وہ برق سی چمک اُٹھی　　سحاب کے غبار میں
وہ آگ سی بھڑک اُٹھی　　اُفق کے لالہ زار میں
وہ ذرّہ ذرّہ خاک کا

نظر فروز ہو گیا

وہ قطرہ قطرہ آب کا　　چمک اُٹھا دمک اُٹھا
کھُلا وہ حجلۂ سحر　　ہوا وہ حسن جلوہ گر

اُٹھی حسینۂ سحر　　پہن کے سر پہ تاجِ زر
لباسِ نور زیبِ بر
چڑھی فرازِ کوہ پر
وہ خندۂ نگاہ سے　　پہاڑ طور بن گئے
وہ عکسِ جلوہ گاہ سے　　سحاب نور بن گئے
نوائے جوئبار اُٹھی
صدائے آبشار اُٹھی
ہواؤں کے رباب اُٹھے　　خوش آمدید کے لئے
اُٹھی حسینۂ سحر　　پہن کے سر پہ تاجِ زر

نسیم سحر سرا گئی چمن میں گُل کھلا گئی
کلی کو گدگدا گئی
تو پھول کو ہنسا گئی
طرب کے سیلِ نور سے جہاں کی نیند ڈھل گئی
حیات کے وفور سے خوشی کی آنکھ کھل گئی
گلوں کی نکہتیں اٹھیں
ہوا کے دوش پر چلیں
پڑی جو مہر کی نظر تو اوس بن گئی گہر
نسیم سحر سرا گئی چمن میں گل کھلا گئی

پرند نغمہ ریز ہیں ہوائیں عطر بیز ہیں
ہے طائروں کی راگنی
فضاؤں میں بسی ہوئی

ہوا کی لرزشیں بڑھیں   چمن کی لہر جاگ اُٹھی
ضیا کی بارشیں ہوئیں   ہر ایک لہر جاگ اُٹھی
ترنّم ہزار سے
گُلوں کو وجد آ گئے
ترانے سُن کے جھُوم کے   درخت جھُومنے لگے
پرند نغمہ ریز ہیں   ہوائیں عطر بیز ہیں

کنارِ گنگ - برہمن   جوان و پیر، مرد و زن
چڑھا کے دیوتا کو جل
وہ جُھک رہے ہیں سر کے بل
وہ ساریوں کو باندھ کر   نہا رہے ہیں گُل بدن
بروئے آب سر بسر   کِھلا ہُوا ہے اک چمن
وہ اک مہا تپسوی

بہت بڑا اچھی ستی

ہے اور ہی جہان میں لگا ہے گیان دھیان میں
کنارِ گنگ۔ برہمن جوان و پیر مرد و زن

اُٹھے حسین خواب سے کہ دھوئیں مُنہ گلاب سے
یہ عشوہ سازیوں میں ہیں
ادا طرازیوں میں ہیں
اُدھر سے عشق بھی اُٹھا مگر ہے اپنی ہانک میں
اُدھر گیا ادھر پھرا فضول تاک جھانک میں
شباب جس کی رات بھی
نشاط و عیش میں کٹی
وہ نیند ہی کا ہو گیا اُٹھا پھر اُٹھ کے سو گیا
اُٹھے حسین خواب سے کہ دھوئیں مُنہ گلاب سے

طرب نواز جاگ اُٹھے اور اُن کے ساز جاگ اُٹھے

ہوا ہے راگ مُنتشر

فضا میں کھیل کھیل کر

اُمنگ کے خروش میں خیال کی ترنگ میں

سب اپنے اپنے جوش میں سب اپنے اپنے رنگ میں

اساوری کی لَے اُٹھی

دلوں کو مست کر گئی

ہواؤں میں سما گئی فضاؤں کو بسا گئی

طرب نواز جاگ اُٹھے اور اُن کے ساز جاگ اُٹھے



فرصت کی تلاش

یوں وقت گزرتا ہے فرصت کی تمنا میں
جس طرح کوئی پتّا
بہتا ہوُا دریا میں
ساحل کے قریب آکر
چاہے کہ ٹھہر جاؤں
اور سیر ذرا کرلوں
اس عکسِ مشجّر کی
جو دامنِ دریا پر زیبائشِ دریا ہے
یا بادکا وہ جھونکا
جو وقفِ روانی ہے
اک باغ کے گوشے میں

چاہے کہ یہاں دم لوں
دامن کو ذرا بھر لوں
اُس پھول کی خوشبو سے جس کو ابھی کھلنا ہے
فرصت کی تمنّا میں یوں وقت گزرتا ہے

افکارِ معیشت کے فرصت ہی نہیں دیتے
مَیں چاہتا ہوں دل سے
کچھ کسبِ ہنر کر لوں
گلہائے مضامیں سے
دامانِ سخن بھر لوں
ہے بخت مگر واژوں
فرصت ہی نہیں ملتی
فرصت کو کہاں ڈھونڈوں فرصت ہی کا رونا ہے

پھر جی میں یہ آتی ہے
کچھ عیش ہی حاصل ہو
دولت ہی ملے مجھ کو
وہ کام کوئی سوچوں
پھر سوچتا یہ بھی ہوں
یہ سوچنے کا دھندا فرصت ہی میں ہوتا ہے
فرصت ہی نہیں دیتے افکارِ معیشت کے



چاند کی سیر

عطر بیز لالہ زار نغمہ ریز جُوئبار
حشر خیز آبشار
کیفِ موجِ بیقرار چاندنی میں کوہسار

تھا بہار در بہار
مَیں یہ شانِ کردگار
دیکھتا چلا گیا

شہر اور بن خموش   دشت اور چمن خموش
تَن خموش۔ مَن خموش
سَب جہازراں خموش   کشتیٔ رواں خموش
بحرِ بے کراں خموش
اور مَیں بھی ہاں خموش
دیکھتا چلا گیا

دُور اور قریب چُپ   ہر طرف عجیب چُپ
خوشنما مہیب چُپ

کائنات پر سکوت ساراخشک وتر سکوت
شور کا اثر سکوت
کچھ نہیں مگر سکوت
دیکھتا چلا گیا

وہ کنارِ آب کی محفلیں شراب کی
مستیاں شباب کی
خواہشیں ثواب کی کاہشیں عذاب کی
وہم اور خواب کی
زندگی حباب کی
دیکھتا چلا گیا

حسن شانِ ناز میں غرق احتراز میں

عاشقی نیازمیں

اس کی خود فروشیاں اور سخت کوشیاں
اُس طرف خموشیاں
صبر گرم جوشیاں
دیکھتا چلا گیا

پاکباز نازنیں وقفِ آہِ آتشیں
مرگ و یاس در کمیں
اک جوانِ خود پرست بادۂ خودی میں مست
شوخ اور دراز دست
میں یہ سب بلند و پست
دیکھتا چلا گیا

رنجشیں کدورتیں برہمی کی صورتیں
زیست کی ضرورتیں
ساری آشنائیاں ظاہری صفائیاں
باطنی بُرائیاں
صلح اَور لڑائیاں
دیکھتا چلا گیا

دوست کے فراق میں جوشِ اشتیاق میں
پائے چُست وچاق میں
گردشوں کو باندھ کر محوِ کُلفتِ سفر
اک جوانِ بے جگر
دل بھر آیا۔ میں مگر
دیکھتا چلا گیا

بادشاہ کا مزار جس سے عبرت آشکار
بیکسی بھی سوگوار
اور گدا کی قبر پر جمع سینکڑوں بشر
میں یہ فقر کا اثر
اور مآلِ مال و زر
دیکھتا چلا گیا

تولیدِ عصمت

اے کہ ہے صبحِ ازل تیرے تبسم کی ضیا
تو کرن سورج کی ہے۔ یا کوئی ٹکڑا نور کا
تیرے چہرے سے عیاں ہے صاف تنویرِ حیا
کلکِ قدرت نے بنایا تجھ کو تصویرِ حیا

اے گُلِ خوش رنگ تو کس گلستاں کا پھول ہے !
دل یہ کہتا ہے۔کہ باغِ کُن فکاں کا پھول ہے
سوئے ہستی تو عدم سے آئی ہے مُنہ موڑ کر
آکے رشتہ ہم سے جوڑا سارے رشتے توڑ کر
صورتِ عفّت سراپا پیکرِ عصمت ہے تُو
باپ ماں کے واسطے اک آیۂ رحمت ہے تُو

ابھی تو مَیں جوان ہوں

(۱)

ہَوا ابھی خوشگوار ہے گلُوں پہ بھی نکھار ہے
ترنّمِ ہزار ہے بہارِ پُر بہار ہے
کہاں چلا ہے ساقیا!

ادھر تو لوٹ ادھر تو آ!

ارے یہ دیکھتا ہے کیا؟

اٹھا سبو، سبو اٹھا۔

سبو اٹھا پیالہ بھر   پیالہ بھر کے دے ادھر

چمن کی سمت کر نظر   سماں تو دیکھ بے خبر

وہ کالی کالی بدلیاں

افق پہ ہو گئیں عیاں

وہ اک ہجومِ مے کشاں

ہے سوئے میکدہ رواں

یہ کیا گماں ہے بدگماں   سمجھ نہ مجھ کو ناتواں

خیالِ زہد ابھی کہاں

ابھی تو میں جوان ہوں



(۲)

عبادتوں کا ذکر ہے نجات کی بھی فکر ہے
جنون ہے ثواب کا خیال ہے عذاب کا
مگر سنو تو شیخ جی!
عجیب شے ہیں آپ بھی!
بھلا شباب و عاشقی
الگ ہوئے بھی ہیں کبھی؟

حسین جلوہ ریز ہوں ادائیں فتنہ خیز ہوں
ہوائیں عطر بیز ہوں تو شوق کیوں نہ تیز ہوں؟
نگارہائے فتنہ گر
کوئی ادھر کوئی اُدھر
اُبھارتے ہوں عیش پر
تو کیا کرے کوئی بشر؟

چلو جی قصہ مختصر　　تمہارا نقطۂ نظر
درست ہے تو ہو۔ مگر
ابھی تو مَیں جوان ہوں

---

(۳)

یہ گشت کوہسار کی　　یہ سیر جوئبار کی
یہ بلبلوں کے چہچہے　　یہ گُل رُخوں کے قہقہے
کسی سے میل ہو گیا
تو رنج و فکر کھو گیا
کبھی جو بخت سو گیا
یہ ہنس گیا۔ وہ رو گیا
یہ عشق کی کہانیاں　　یہ رس بھری جوانیاں
اُدھر سے مہربانیاں　　ادھر سے لن ترانیاں

یہ آسمان یہ زمیں
نظارہ ہائے دلنشیں
انہیں حیات آفریں
بھلا میں چھوڑ دوں یہیں!
ہے موت اس قدر قریں   مجھے نہ آئے گا یقیں
نہیں نہیں۔ ابھی نہیں
ابھی تو میں جوان ہوں

---

(۴)

نہ غمِ کشود و بست کا   بلند کا نہ پست کا
نہ بود کا نہ ہست کا   نہ وعدۂ الست کا
اُمید اور یاس گُم
حواس گُم۔ قیاس گُم

نظر سے آس پاس گُم
ہمہ۔ بجز گلاس گُم

نہ مے میں کچھ کمی رہے　　قدح سے ہمدمی رہے
نشست یہ جمی رہے　　یہی ہماہمی رہے

وہ راگ چھیڑ مطربا!
طرب فزا الم رُبا
اثر صدائے ساز کا
جگر میں آگ دے لگا

ہر ایک لب پہ ہو صدا　　نہ ہاتھ روک ساقیا
پلائے جا۔ پلائے جا
ابھی تو مَیں جوان ہوں



برسات

(۱)

آئی ہے برسات   چھائی ہے برسات
کوہ و دمن پر   دشت و چمن پر   شہر اور بن پر
دوشیزہ جوبن   بے ساختہ پن
رنگیں جوانی   سبز اور دھانی
گلپوش جلوے   مدہوش نغمے
دلکش فضائیں
ٹھنڈی ہوائیں
اودی گھٹائیں   لائی ہے برسات
آئی ہے برسات   چھائی ہے برسات

(۲)

گھر گھر کے آیا ہر پھر کے چھایا

ٹھنڈا و دھواں دھار تاریک و بسیار ابر گہربار

بجلی چمکنا آنکھیں جھپکنا

توبہ یہ کڑکا سینوں کا دھڑکا

بوندوں کی بھرمار مینہ موسلا دھار

ہر سمت یک دم

جل تھل کا عالم

پُرلطف موسم حق نے دکھایا

گھر گھر کے آیا ہر پھر کے چھایا



(۳)

بیٹھے ہیں مے خوار نشّوں میں سرشار

گھربار برباد مے خانے آباد بندش سے آزاد

جیبیں ہیں خالی ہمت ہے عالی
پروا نہیں ہے دھڑکا نہیں ہے
دیتا ہے ساقی قرض آج خود ہی
دریا دلی ہے
سو دلبری سے
اپنی خوشی سے بے عذر و تکرار
بیٹھے ہیں مے خوار نشتوں میں سرشار



(۴)

آموں کے نیچے ڈالے ہیں جھولے
مہ پیکروں نے سیمیں تنوں نے برق افگنوں نے
گیت اُن کے پیارے میٹھے رسیلے

ہلکی صدائیں   سادہ ادائیں
گُل پیرہن ہیں   غنچہ دہن ہیں
خود مُسکرانا
خود منہ چڑانا
پھر جھینپ جانا   اُلٹے پنے سے
آموں کے نیچے   ڈالے ہیں جھولے

(۵)

اِٹھلا رہی ہیں   اِترا رہی ہیں
خوبانِ ہندی حورانِ ارضی رونق گھروں کی
نازک دوپٹے   رنگین۔ ہلکے
سر پر سنبھالے   شانوں پہ ڈالے
سینہ لاکھ برسے   جی لاکھ ترسے

نکلیں نہ گھر سے
شوہر کے ڈر سے
اپنی نظر سے   شرما رہی ہیں
اٹھلا رہی ہیں   اترا رہی ہیں



(۶)

بے فکر آزاد   خوش باش دلشاد
ناداں انجان   کرتی ہیں سامان   پکتے ہیں پکوان
نوخیز کم سن   ہم عمر ہم سن
ننھے فرشتے   اور ناطے رشتے
گڑیا کی شادی   مل کر رچا دی
ڈھولک بجانا
مل مل کے گانا

سب کچھ بھلانا ماں بھی نہیں یاد
بے فکر آزاد خوش باش دل شاد

---

(۷)

گلشن کی دُنیا ہے مست گویا
جوشِ نمو سے اور رنگ و بُو سے حق سترہ سے
کوئل کی آواز مستی کی غماز
ہر برگ مینوش ہر شاخ مدہوش
پھولوں کی بستی ہے غرقِ مستی
میکش پپیہے
ہیں مست پی کے
بلبل کے نغمے مستی سراپا
گلشن کی دُنیا ہے مست گویا

(۸)

زاہد کی گھاتیں   بے کیف باتیں

عقبیٰ کے جھگڑے   جنّت کے قصّے   پینے کے طعنے

یہ بھی رہا خوب!   واللہ کیا خوب!

رندا و رہٹ جائیں!   ہم اور پلٹ جائیں!

میخانہ چھوڑیں!   شیشوں کو توڑیں!

دل پر کریں جبر!

عشّاق۔ اور صبر!

یہ رُت ہو یہ ابر!   یہ دن یہ راتیں!

زاہد کی گھاتیں   بے کیف باتیں



تاروں بھری رات

(۱)

بحر اور بر میں خشک اور تر میں
بیٹھی ہے چُپ چاپ ہر رہگذر میں
نیندوں کے ماتے سوتے ہیں گھر میں
خوابوں کے طائر دامِ نظر میں

رُخ پوشیوں کا
مدہوشیوں کا
خاموشیوں کا
سودا ہے سر میں

یہ کون دیکھے یہ کون جانے
یہ کون سمجھے یہ کون مانے

تاروں بھری رات

نیلم پری رات

جلووں سے معمور نزدیک اور دور

آتی ہے کیونکر چھاتی ہے کیونکر

افسوں پڑھ کر

شاعر کے دل پر

کرتی ہے یکسر

جادوگری رات

تاروں بھری رات

(۲)

دُنیائے انساں شہرِ خموشاں

دیکھے تو کوئی رنگِ گلستاں

ہنستے ہیں غنچے کھِلتی ہیں کلیاں
ہر شاخ مسرُور ہر پھُول خنداں
سبزے میں ساری
پتّوں پہ طاری
اک رُوحِ بہاری
اک کیف لرزاں
ہر برگِ گُل میں موتی جڑے ہیں
موتی ہی موتی بکھرے پڑے ہیں
گویا دُلہن ہے
گلشن کی ہر شے
گھونگٹ نکالے چہرے پہ ڈالے
تاریک آنچل باریک آنچل
دُھندلی ضیا میں

شب کی ردا میں
اپنی حیا میں
چُپ ہے مگن ہے
گویا دُلہن ہے

---

(۳)

رکھوالا لڑکا کھیتوں کا دُولھا
بنسی بجا کر گانے کا رسیا
مینڈوں کے اوپر پھرتا ہے تنہا
ہاتھوں میں بنسی پیروں سے ننگا
البیلے پن میں
اصلی پھبن میں
گوکل کے بن میں

جیسے کنہیّا

ہنسی کی لے میں   گُم ہیں فضائیں
پھرتی ہیں مدہوش   ہر سُو ہوائیں

جادو ہے کیا ہے؟
یا معجزا ہے

کوہ و بیاباں   کھیت اور میداں
باہوش بیہوش   سب خود فراموش

کیوں او گلے باز!
تیرا یہ انداز!
یہ سوز یہ ساز!
تجھ کو پتا ہے؟
جادو ہے کیا ہے؟



(۴)

دلکش نظارے شب زاد سارے
ندی کی تہ میں رقصاں ہیں تارے
گاتی ہیں لہریں گیت ایسے پیارے
چُپ دم بخود ہیں دونوں کنارے
ہر سمت سبزا
سرمستِ صہبا
لیٹا ہے کیسا
پاؤں پسارے
ہے سرسراہٹ خاموشیوں میں
یعنی ہوا ہے سرگوشیوں میں
خاموش پانی
محوِ روانی

چلتا مچلتا   پہلو بدلتا
بہتا بہاتا   کچھ گنگناتا

چُپ ہے بظاہر
تاروں کا دفتر
سینے کے اندر
جا اتر گیا نی
خاموش پانی

---

(۵)

دامانِ کہسار   اک خامشی زار
چیل اور دیودار   دیو ہیں کہ اشجار
توبہ! درندے   بے رحم۔ خونخوار
لیکن یہاں بھی   شب ہے طرحدار

پانی کی رَو میں
ہر برگِ نو میں
شبنم کی ضَو میں
تارے نمودار

یہ سرزمیں ہے آزادِ دُنیا
ہے تو یہیں ہے آبادِ دُنیا

اے شانِ فطرت!
یہ خوانِ فطرت!

ہر ایک وادی گلزار زادی
اس وقت ہر جھیل ضَوریز قندیل

یہ رات کیا ہے!
شانِ خدا ہے!
بکھرا پڑا ہے

سامانِ فطرت!

اے شانِ فطرت!

کرشن کنھیا

اے دیکھنے والو

اس حسن کو دیکھو

اس راز کو سمجھو

یہ نقشِ خیالی یہ فکرتِ عالی

یہ پیکرِ تنویر یہ کرشن کی تصویر

معنی ہے کہ صورت صنعت ہے کہ فطرت

ظاہر ہے کہ مستور

نزدیک ہے یا دور

یہ نار ہے یا نور

دُنیا سے نرالا
یہ بانسری والا
گوکل کا گوالا
ہے سحر کہ اعجاز؟ کھُلتا ہی نہیں راز
کیا شان ہے واللہ! کیا آن ہے واللہ!
حیران ہوں یہ کیا ہے؟ اک شانِ خدا ہے!
بُت خانے کے اندر
خود حُسن کا بُتگر
بُت بن گیا آکر

وہ طُرفہ نظارے

یاد آ گئے سارے
جمنا کے کنارے
سبزے کا لہکنا   پھولوں کا مہکنا
گھنگھور گھٹائیں   سرمست ہوائیں
معصوم اُمنگیں   اُلفت کی ترنگیں
وہ گوپیوں کے ساتھ
ہاتھوں میں دئے ہاتھ
رقصاں ہوا برجناتھ

بنسی میں جو لے ہے
نشہ ہے نہ مے ہے
کچھ اَور ہی شے ہے
اک رُوح ہے رقصاں   اک کیف ہے لرزاں

اک عقل ہے بیہوش   اک ہوش ہے مدہوش
اک خندہ ہے سیال   اک گریہ ہے خوش حال

اک عشق ہے پُر نور
اک حُسن ہے مجبور
اک سحر ہے مسحُور

دربار میں تنہا
لاچار ہے کرشنا
آ شیام ادھر آ

سب اہلِ خصومت   ہیں درپئے عزت
اور راج دُلارے   بُزدل ہوئے سارے
پردہ نہ ہو تاراج   بیکس کی رہے لاج
آ جا میرے کالے

بھارت کے اُجالے

دامن میں چھپالے

وہ ہوگئی اَن بَن

وہ گرم ہوا رَن

مغموم ہے ارجن

وہ آگئے جگدیش   وہ مِٹ گئی تشویش

اُپدیش سُنایا   سب وہم بُھلایا

عم زاد کا غم کیا!   اُستاد کا غم کیا!

لو ہو گئی تدبیر

لو بن گئی تقدیر

لو چل گئی شمشیر

سیرت ہے عدو سوز

صورت نظر افروز

دل کیفیت اندوز

غصّے میں جو آجائے بجلی ہی گرا جائے

اور لطف پر آئے تو گھر بھی لُٹا ئے

پریوں میں ہے گلفام را دھا کے لئے شیام

بلرام کا بھیّا

متھرا کا بسیّا

بندرا میں کنہیّا

بن ہو گئے ویراں

برباد گلستاں

سکھیاں ہیں پریشاں

کیا آگئی تباہی!
قسمت کی کم نگاہی!!

دل سرد ہو رہے ہیں   رُخ زرد ہو رہے ہیں
اس محشرِ بلا میں
اس لجۂ فنا میں
اس سیلِ بادپا میں
سب اہلِ یاس گُم ہیں   ہوش و حواس گُم ہیں
کچھ محو ہیں دعا میں
کچھ نالۂ و بکا میں
کچھ شکوۂ خدا میں

بیٹھی ہے ایک بیوہ   ہے صبر جس کا شیوہ

دل ہاتھ سے دبائے
بچّہ گلے لگائے
تیرِ اُمید کھائے
یہ باپ کی نشانی سرمایۂ جوانی
اک دن جوان ہوگا
امّاں کا مان ہوگا
حق مہرباں ہوگا

اک نوجواں بداختر بھاگا ہے گھر سے لڑ کر
چھوڑے تھے باپ ماں بھی
بیوی بھی اُور مکاں بھی
اب چھوڑتا ہے جاں بھی
اے کاش میں نہ آتا اے کاش لوٹ جاتا

اے طبعِ خود سر افسوس
اے طیش تجھ پر افسوس
افسوس یکسر افسوس

یہ دیوزاد موجیں! یہ بدنہاد موجیں!
آیا پھر ایک ریلا
کشتی بنی ہے تنکا
بس ہو چلا صفایا
تدبیر رو رہی ہے تقدیر سو رہی ہے
ملّاح تیرے نکلے
دریا میں پیر نکلے
افسوس غیر نکلے

طوفانِ غم بپا ہے   فریاد کی صدا ہے
ہے کون جو سنبھالے
کشتی ترے حوالے
یا رب تو ہی بچا لے
اے نوح کے کھویّا   لگ جائے پار نیّا
بندوں کا تو خدا ہے
اور تُو ہی ناخدا ہے
تیرا ہی آسرا ہے



بسنتی ترانہ

لو پھر بسنت آئی　　پھولوں پہ رنگ لائی

چلو بے درنگ

لبِ آبِ گنگ

بجے جلترنگ

من پر اُمنگ چھائی　　پھولوں پہ رنگ لائی

لو پھر بسنت آئی

آفت گئی خزاں کی　　قسمت پھری جہاں کی

چلے مے گُسار

سوئے لالہ زار

مئے پردہ دار

شیشے کے در سے جھانکی قسمت پھری جہاں کی
آفت گئی خزاں کی

کھیتوں کا ہر چرندہ باغوں کا ہر پرندہ
کوئی گرم خیز
کوئی نغمہ ریز
سُبک اور تیز
پھر ہو گیا ہے زندہ باغوں کا ہر پرندہ
کھیتوں کا ہر چرندہ

ہر شاخ میں شگوفے انداز نو سے پھوٹے
ہوا بخت سبز
ہرا رخت سبز

ہیں درخت سبز

بن بن کے سبز نکلے   انداز نو سے پھوٹے

ہر شاخ میں شگوفے

پھولی ہوئی ہے سرسوں   پھولی ہوئی ہے سرسوں

نہیں کچھ بھی یاد

یوں ہی بامراد

یوں ہی شاد شاد

گویا رہے گی برسوں   پھولی ہوئی ہے سرسوں

پھولی ہوئی ہے سرسوں

لڑکوں کی جنگ دیکھو   ڈور اور پتنگ دیکھو

کوئی مار کھائے

کوئی کھلکھلائے
کوئی مسکرائے

طفلی کے رنگ دیکھو ڈور اور پتنگ دیکھو
لڑکوں کی جنگ دیکھو

ہے عشق اور جنوں بھی مستی بھی جوشِ خوں بھی
کہیں دل میں دَرد
کہیں آہِ سرد
کہیں رنگ زَرد
ہے یوں بھی اور یوں بھی مستی بھی جوشِ خوں بھی
ہے عشق اور جنوں بھی

اک نازنیں نے پہنے پھولوں کے زرد گہنے

ہے مگر اُداس
نہیں پی کے پاس
غم و رنج و یاس
دل کو پڑے ہیں سہنے اک نازنیں نے پہنے
پھولوں کے زرد گہنے

فرقتِ یار

جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں
جی نڈھال ہے اے میرے دوستو
مجھے لے چلو ہاں مجھے لے چلو
یا نشاط ہیں۔ یا شالا مار میں جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں
عندلیب کے نغمے فضول سے

رنگِ حسرت عیاں پھول پھول سے

ہیں خزاں کے طریق بہار میں   جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں

میرے بخت کی یہ نامرادیاں

دامن سست اُداس ہیں وادیاں

چھائی غم کی گھٹا کوہسار میں   جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں

چشمہ صورتِ چشمِ پُرآب کیوں

ندی ماہی مثال بیتاب کیوں

کیوں وقار نہیں آبشار میں   جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں

ساحل آئینہ وار خموش ہے

اور موج کو حیرت کا جوش ہے

کیفِ نغمہ نہیں جوئبار میں   جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں

جاؤ پاس میرے کوئی آؤ نا

مجھے چھیڑو نہ مجھ کو ستاؤ نا

میں ہوں آج کسی انتظار میں　　　جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں

یہ تو جانتا ہوں کہ وہ آئیں گے

میرے دوست ضرور اُنہیں لائیں گے

لیکن صبر نہیں دلِ زار میں　　　جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں

جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں

جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں

زندگی

جنبشِ لب سے نہیں تابِ بیانِ زندگی

ہے فنا تمہیدِ شرحِ داستانِ زندگی

جستجو سے یہ ملا۔ آخر نشانِ زندگی

چند قبریں نقشِ پائے رہروانِ زندگی

اے مصور ایک تصویر اس طرح کی کھینچ دے
بارِ دوشِ بیکسی کو دِ گران زندگی

ہیں خیالی صورتیں ہنگامہ آرائے وجود
محشرستانِ توہّم ہے جہانِ زندگی

ہے مثالِ دُود اپنا عالمِ بود و نبود
یعنی شاخِ شعلہ پر ہے آشیانِ زندگی

صرفِ گلشن ہے بجائے آب خونِ آرزو
ہے بہارِ زندگی گویا خزانِ زندگی

آرزو۔ پھر آرزو کے بعد خونِ آرزو
ایک مصرع میں ہے ساری داستانِ زندگی

پھر سبق کچھ اور ہے بعدِ نصابِ زندگی
ہے فقط دیباچۂ عبرت کتابِ زندگی

یہ عدم والوں کی خاموشی نے ثابت کر دیا
تھا عذابِ قبر سے بدتر عذابِ زندگی

مطربانِ عیش نے گو رنگ بدلے نو بہ نو
ایک ہی دُھن پر رہا تارِ ربابِ زندگی

ہے طلوعِ صبحِ پیری تک فقط اس کی نمود
قطرۂ شبنم ہے گویا آفتابِ زندگی

ہے تری بُنیاد ہی میں اختلافِ باد و آب
کس بھروسے پر اُبھرتا ہے حبابِ زندگی

محوِ رویائے غم و شادی ہیں دو خوابیدہ ہوش
کامیابِ زندگی ناکامیابِ زندگی

حرفِ باطل ہی لکھا دیکھا اس اندیشے کے بعد
یعنی خوابِ زندگی تعبیرِ خوابِ زندگی

جستجو فعلِ عبث رہبر نہ منزل سب غلط
خضر کی مانند ہے ناپید آبِ زندگی

آزاد وادی

شہر سے دُور شہریار سے دُور
ساری دُنیائے آشکار سے دُور
گرمیِ عیش بے ثبات سے دُور
سردیِ خونِ بے حیات سے دُور
دُور ہر ایک شاہراہ سے دُور
دُور انسان کی نگاہ سے دُور

ایک وادی ہے کوہساروں میں حُسن کے فطرتی نظاروں میں

شانِ حق آشکار چار طرف
ایک خودرَو بہار چار طرف

چیل اور دیودار چار طرف
قدرتی لالہ زار چار طرف
نعرہ زن آبشار چار طرف
ندیاں بے شمار چار طرف
پھوٹتے ہیں ہزارہا چشمے   سرد شفاف خوشنما چشمے
پٹ رہی ہے زمین پھولوں سے
بن گئی نازنین پھولوں سے
سرخ پھولوں سے زرد پھولوں سے
اور کہیں لاجورد پھولوں سے
بیلیں کیا تن رہی ہیں پھولوں سے
دلہنیں بن رہی ہیں پھولوں سے
جھاڑیاں ہیں تمام پھول ہی پھول   نہیں کانٹے کا نام پھول ہی پھول
ہیں زمین اور آسماں آزاد

تیر آزاد ہے کماں آزاد
ہیں وحوش و طیور سب آزاد
آتش و خاک و نور سب آزاد
آب آزاد ہے ہوا آزاد
بندے آزاد ہیں خدا آزاد

بلبل آزاد اور گل آزاد — یعنی فطرت کا جزو و کل آزاد
اُس طرف کوہ کی ینچان کے پاس — ہے مرا جھونپڑا چٹان کے پاس

پیچا
سرودِ مستاں

شراب خانہ ہے بزمِ ہستی — ہر ایک ہے محوِ عیش و مستی
ناں ہینی و مے پرستی — ارے یہ ذلت! ارے یہ پستی!!

شعار رندانہ کر پیئے جا

اگر کوئی تجھ کو ٹوکتا ہے   شراب پینے سے روکتا ہے
سمجھ اُسے ہوش میں نہیں ہے   خرد کے آغوش میں نہیں ہے
تو اُس سے جھگڑا نہ کر پیئے جا

خیالِ روزِ حساب کیسا   ثواب کیسا عذاب کیسا
بہشت و دوزخ کے یہ فسانے   خدا کی باتیں خدا ہی جانے
فضول سوچا نہ کر پیئے جا

نہیں جہاں میں مدام رہنا   تو کس لئے تشنہ کام رہنا
اُٹھا اُٹھا ہاں اُٹھا سبو کو   تمام دُنیا کی ہاؤ ہُو کو
غریقِ پیمانہ کر پیئے جا

کسی سے تکرار کیا ضرورت   فضول اصرار کیا ضرورت (۱)
کوئی پیئے۔ تو اُسے پلادے   اگر نہ مانے تو مُسکرادے
ملال اصلا نہ کر۔ پیئے جا

(۲) تجھے سمجھتے ہیں اہلِ دُنیا خراب خستہ۔ ذلیل۔ رُسوا
نہیں عیاں اُن پہ حال تیرا کوئی نہیں ہم خیال تیرا
کسی کی پروا نہ کر بڑھے جا

ہلالِ عید

جیتی رہو۔ مگر مجھے آتا نہیں نظر
بیٹی! کہاں ہے چاند؟ مجھے بھی بتا کدھر؟
افسوس اب نگاہ بھی کمزور ہو گئی
نعمت خدا نے دی تھی بڑھاپے میں کھو گئی
مینارِ خانقاہ کے اوپر؟ کہاں کہاں؟
کچھ بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں ہے وہاں کہاں

ہاں ڈالیوں کے بیچ میں ہوگا وہیں کہیں
وہ ہے جہاں پہ ابر کی سُرخی کہیں کہیں
اب ہو چکی ہے عمر بھی نو اَور ساٹھ سال
گزرے ترے خُسر کو بھی گزرے ہیں آٹھ سال
نغمے خوشی کے اور وہ ترانہ گزر گیا
وہ دن گزر گئے وہ زمانہ گزر گیا
تیری طرح سے مَیں بھی کبھی ہاں جوان تھی
وہ دن بھلے تھے اَور بھلی اُن کی شان تھی
ہر اک سے پہلے دیکھتی تھی میں ہلالِ عید
دس بیس دن سے رہتا تھا ہر دم خیالِ عید
یہ اُن دنوں کی بات ہے۔ وہ بات اب کہاں!
وہ شام و صبح اَور وہ دن رات اب کہاں!
اب دن تمہارے۔ وقت تمہارا۔ تمہاری عید

بیٹی تمہاری عید سے ہے اب ہماری عید
ہے لاکھ لاکھ شکر خدائے کریم کا
کرتی ہوں روز ورد کلام حکیم کا
عینک بغیر معنی و تفسیر پر۔ مگر
افسوس ہے۔ کہ میری ٹھہرتی نہیں نظر
صدقے۔ کہاں ہے چاند؟ مجھے بھی ذرا دکھا
میں بھی تو چاند دیکھ لوں عینک اُٹھا ذرا
اے ہاں ٹھہر۔ وہ تار سا بیشک یہی تو ہے
مجھ کو نظر نہ آیا تھا اب تک۔ وہی تو ہے
صد شکر چاند دیکھ لیا آؤ دعا کریں
اور چل کے پھر فریضۂ مغرب ادا کریں
یا رب ترے حضور میں حاضر کھڑی ہوں میں
عاصی گنہگار تو بے شک بڑی ہوں میں

لیکن مرے گناہ وخطا پر نگہ نہ کر
یارب تو اپنی شانِ کریمی پہ رکھ نظر

اللہ میرے چاند کی نورِ نظر کی خیر
میرے کماؤ۔ میرے مسافر پسر کی خیر

اللہ مجھ کو گھر کا اُجالا نصیب ہو
بیٹا بہو کو۔ اور مجھے پوتا نصیب ہو

بیکس کے عجز کو ملے رتبہ قبول کا
سُن لے مری دُعاؤں کو صدقہ رسولؐ کا

Munir Ahmad.





تغزّل

کیا جنوں آموز ہے مستقبلِ دُنیا مجھے
گلشنِ ہستی نظر آتا ہے اک صحرا مجھے

عقل کی وادی میں ہوں گم کردۂ مقصودِ عشق
ڈھونڈتا ہوں اور نہیں ملتا کوئی رستا مجھے

یہ بھی ایک دھوکا تھا نیرنگِ طلسمِ عقل کا
اپنی ہستی پر بھی ہستی کا ہوُا دھوکا مجھے

ضبط کی خودداریوں نے باز رکھّا۔ ورنہ میں؟
دیکھتا موسےٰ مجھے! سینا مجھے! جلوا مجھے!!!

شاعری کیا کفش بردارِ گرامی ہوں حفیظ
بے کمالی کے سوا کوئی نہیں دعوے مجھے

مستوں پہ انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں
دیکھو تو ہوش ہے بھی کسی ہوشیار میں
اب وہ سکونِ یاس نہ وہ اضطرابِ شوق
سینے میں دل ہے یا کوئی لاشہ مزار میں
کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ
پیتا ہوں چھپ کے دامنِ ابرِ بہار میں
وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی
دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں
اب خاک اڑائیے نہ ہمارے مزار کی
اب خاک بھی نہیں ہے ہمارے مزار میں

جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ جاؤ جاؤ ......
جاؤ۔ کہ تم نہیں ہو مرے اختیار میں
ہوں وادیٔ حیات میں اس طرح سُست گام
جیسے ہو پا شکستہ کوئی خارزار میں
تنہائیٔ فراق میں اُمّید بار ہا
گم ہو گئی سکوت کے ہنگامہ زار میں
اللہ بات کیا ہے کہ دیوانگی مری
دیوانگی نہیں نگہ ہوشیار میں
وہ عندلیبِ گلشنِ معنٰے ہوں میں حفیظ
سوزِ سخن سے آگ لگا دوں بہار میں

عشق سودا عقل ہے اک ابلہی میرے لئے
کس قدر بے لطف شے ہے زندگی میرے لئے

ہے تپاکِ اہلِ ظاہر دل لگی میرے لئے
کیونکہ بے معنی ہے لفظِ دوستی میرے لئے

رونے والوں نے مسیحا کو کیا جھک کر سلام
لائے تھے حضرت نویدِ زندگی میرے لئے

آرزوئے جلوہ ہائے حسنِ رنگا رنگ نے
باندھ رکھا ہے طلسمِ زندگی میرے لئے

ہائے دشمن کے لئے تجھ کو بظاہر دشمنی!
اور وفا دشمن۔ فریبِ دوستی میرے لئے

توبہ توبہ شیخ جی! توبہ کا پھر کس کو خیال!
جب وہ خود کہہ دے کہ پی تھوڑی سی پی میرے لئے

دستِ تقدیر اور نقشِ مدعا باندھے غلط!
بت شکن کرنے لگے کیوں بت گری میرے لئے

کیا کہوں نا آشنایانِ مآلِ عشق سے تھے

کر گئے جو وضعِ رسمِ عاشقی میرے لئے

آنے لگا ہے اپنی حقیقت سے ڈر مجھے
کیوں دیکھتے ہیں غور سے اہلِ نظر مجھے
ہے خوابِ مرگ زندگیِ تازہ کی دلیل
یہ شام دے رہی ہے نویدِ سحر مجھے
بدلی ہوئی نگاہ کو پہچانتا ہوں میں
دینے لگے پھر آپ فریبِ نظر مجھے
لے جاؤ ساتھ ہوش کو اے اہلِ ہوش جاؤ
ہے خوب اپنی بے خبری کی خبر مجھے
لو وہ تو آکے بیٹھ گئے میرے سامنے
اُٹھنا پڑے نہ بزم سے دل تھام کر مجھے
کھو یا گیا ہوں بے خودیِ ذوقِ عشق میں

اے عقل جا کے لا تو ذرا ڈھونڈھ کر مجھے
ہوتا ہے کون موت پہ عاشق مرے سوا؟
سُوجھا نہ یہ فریب کسی کو۔ مگر مجھے
"اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی"
پھر یہ نہیں تو کھا گئی کس کی نظر مجھے



ہے طرب زارِ جوانی پہ بہار آئی ہوئی
ہر طرف ہے آرزو ہی آرزو چھائی ہوئی
موت کے چہرے پہ کیوں ہے مُردنی چھائی ہوئی
دیکھنا کون آگیا۔ کیوں ٹل گئی آئی ہوئی؟
چھوڑ بھی یہ سلسلہ او نامرادِ انتظار
موت بیٹھی ہے ترے بالیں پہ اُکتائی ہوئی
اللہ اللہ کیا ہوا انجامِ کارِ آرزو!

توبہ توبہ کس قدر ہنگامہ آرائی ہوئی!

پھر کوئی بادل نہ اُٹھا ہو اُفق پر دیکھنا
پھر فضائے توبہ پر ہے بے دلی چھائی ہوئی

اب بنا بیٹھا ہے کیسا بے نیازِ دوجہاں
عشق! جس کے دم سے یہ سب عالم آرائی ہوئی

سیکھ دُنیا ہی میں زاہد حُور سے ملنے کے ڈھنگ
ورنہ روئے گا۔ کہ جنّت میں بھی رسوائی ہوئی

یاس کی بستی میں اک چھوٹی سی امیدِ وصال
اجنبی کی طرح سے پھرتی ہے گھبرائی ہوئی

یہ ہے میرا حاصلِ گلچینیٔ باغِ جمال (۴)
آرزو کی چند کلیاں وہ بھی مُرجھائی ہوئی

ہوگیا جب عشق ہم آغوشِ طوفانِ شباب
عقل بیٹھی رہ گئی ساحل پہ شرمائی ہوئی

خانۂ دل میں کسی پردہ نشیں کی آرزو
آرزو کیا ہے دُلہن بیٹھی ہے شرمائی ہوئی
عشق ہے اپنی وفاؤں سے بھی شرمایا ہوا
عقل ہے اپنی خطاؤں پر بھی اترائی ہوئی

کس شان سے رہتا ہے۔ اللہ کا دیوانہ
انداز ہیں شاہانہ۔ سامان گدایانہ
آمادۂ کج بحثی۔ عاشق بھی ہے ناصح بھی
اک عشق کا سودائی۔ اک عقل کا دیوانہ
توحید یہ نازایسا۔ دل محوِ ایاز ایسا
توڑا نہ گیا تجھ سے محمود یہ بُت خانہ
زنداں کی دیواریں۔ ہیں مانعِ آزادی
ہاں اے سرِ شوریدہ! ہاں ہمت مردانہ

ایمان شکن آنکھیں۔ دل ہیں ہیں دل ان میں
بُت خانے میں کعبہ ہے۔ کعبے میں ہے بُت خانہ

جذبات بھڑکتے ہیں جلووں کی نمائش سے
ہے شمع سے وابستہ۔ سوزِ دلِ پروانہ

اب میری خطاؤں پر کہہ دیتے ہیں وہ ہنس کر
سودائی ہے سودائی۔ دیوانہ ہے دیوانہ

محشر کا تماشا ہے۔ اک نقل جوانی کی
گزرا ہوا ہنگامہ۔ بھولا ہوا افسانہ

ہنستے تھے حفیظ ایسے۔ ہم جان گئے ان کو
یہ طرزِ غزل خوانی۔ یہ شیوۂ رندانہ

میکش چلا ہے شاہدِ رحمت کو ڈھونڈنے
مخمورِ بادۂ عرقِ انفعال ہے

عبرت فزا ہے گورِ غریباں کی بے کسی
میری نظر کے سامنے میرا مآل ہے
مجھ کو زوال کی بھی ترقی نہیں پسند
سُنتا ہوں آسمان عدوئے کمال ہے
ناکامیاں پیامبرِ مرگ ہی نہ ہوں
کیوں اے اُمّیدِ زیست ترا کیا خیال ہے؟
ہے کس قدر غرور شکن راہِ زندگی
جس سر کو دیکھتا ہوں وہی پائمال ہے
گلزارِ آرزو میں ہیں رنگینیاں بہت
کچھ بھی نہیں حفیظ فریبِ خیال ہے

آ ہی گیا وہ مجھ کو لحد میں اُتارنے
غفلت ذرا نہ کی مرے غفلت شعار نے

اب تک اسیرِ دامِ فریبِ حیات ہوں
مجھ کو بھلا دیا مرے پروردگار نے

او بے نصیب دن کے تصور سے خوش نہو
چولا بدل لیا ہے شبِ انتظار نے

برسوں فریبِ عشق دیا اک حسین کو
اس دل نے۔ ہاں اسی دلِ ناکردہ کار نے

سب کیفیت بہشت کی۔ رندوں پہ کھول دی
کوثر کے ایک ساغرِ ناخوش گوار نے

اغیار سے بھی کرنے لگے وعدہ ہائے حشر
عادت بگاڑ دی ہے مرے اعتبار نے

نازک مزاج پھول کا منہ سرخ ہو گیا
چٹکی سی ایک لی تھی نسیم بہار نے

نوحہ گروں کو بھی ہے گلا بیٹھنے کی فکر

جاتا ہوں آپ اپنی اجل کو پکارنے
دیکھا نہ کاروبارِ محبّت کبھی حفیظ
فرصت کا وقت ہی نہ دیا کاروبار نے

حسرتِ ناکام بس۔ اے آرزوئے دید بس
موت کو فقرہ نہ مل جائے بہلنے کے لئے
آنسوؤں کا ایک خرمن ضبط کے پہلو میں ہے
آنکھ ہے محتاج لیکن دانے دانے کے لئے
مدتوں سے جانتا ہوں سر میں ذوقِ سجدہ ہے
یہ نہیں معلوم۔ ہے کس آستانے کے لئے؟
نعمتِ غم میں بھی ہے ایسا تامّل اے خدا!
رہنے دے رکھ چھوڑ اسے اپنے خزانے کے لئے
منزلیں مُلکِ عدم کی صرفِ نسیاں ہوگئیں

موت ہی آئے گی اب رستہ دکھانے کے لئے

اُن کا وعدہ اور مجھے اُس پر یقیں اے ہمنشیں!

اک بہانہ ہے تڑپنے تلملانے کے لئے

(۵) اللہ اللہ اُن کو میرے قتل پر یہ ناز ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سوئے دشمن دیکھتے ہیں داد پانے کے لئے

نسخۂ ہستی میں عبرت کے سوا کیا تھا حفیظ

سُرخیاں کچھ مل گئیں اپنے فسانے کے لئے

خموشی کا کہا سب حال اشکوں نے زباں ہو کر

میری آنکھوں سے حسرت پھوٹ نکلی داستاں ہو کر

خدا حافظ کسی کے رازِ اُلفت کا خدا حافظ

کہ اب تو بات بھی مُنہ سے نکلتی ہے فغاں ہو کر

پیا آبِ بقا اے خضر اب تاثیر بھی دیکھو

قیامت تک رہو پابندِ عمرِ جاوداں ہوکر
کسی کی تفرقہ پردازیوں پر شورِ واویلا
اُٹھا ہے دَیر سے ناقوس مسجد سے اذاں ہوکر
غضب تھا وہ مریضِ غم کی حالت کا بدل جانا
وہ رو دینا کسی نامہرباں کا مہرباں ہوکر
کتابِ دَہر میں اک بابِ عبرت ہے مری ہستی
مجھے دیکھو۔ کہ بیٹھا ہوں مجسم داستاں ہوکر
سُنا ہے اس طرف سے بھی جنابِ عشق گزرینگے
مری ہستی نہ مِٹ جائے غبارِ کارواں ہوکر
قیامت ہیں جنوں انگیزیاں ابنائے عالم کی
اُڑے گا دامنِ دُنیا کسی دن دھجّیاں ہوکر
حفیظ اس سینہ کاوی سے تمہیں حاصل یہی ہوگا
کہ حاصل کچھ نہ ہوگا۔ شاعرِ شیریں بیاں ہوکر

محوِ عبرت ہوں مآلِ نقشِ پا کو دیکھ کر
آئنہ ساں چُپ ہوں تصویرِ فنا کو دیکھ کر

وقتِ پیدائش ہمارے گریہ کا باعث نہ پوچھ
ابتدا ہی سے چلے ہیں انتہا کو دیکھ کر

رفتہ رفتہ ہو ہی جاتے ہیں بہم طرزآشنا
آشنا طرزِ سلوکِ آشنا کو دیکھ کر

انتہائے گمرہی یہ ہے۔ کہ ہنستے ہیں بہم
رہنما مجھ کو ادھر مَیں رہنما کو دیکھ کر

کیا گراں خاطر ہے رنجِ انکشافِ رازِ دوست
سینہ پھٹ جاتا ہے غنچے کا صبا کو دیکھ کر

منزلِ مقصودِ ہستی پر نظر پڑنے لگی
مسلکِ اربابِ تسلیم و رضا کو دیکھ کر

رہروِ راہِ محبت کس قدر ہشیار ہے

راہ کتراتا ہے شکلِ رہنما کو دیکھ کر

کوششِ ناکام کو جانے بھی دے اے چارہ گر!

بوالعجب! تاثیر ہنستی ہے دوا کو دیکھ کر

یہ بات کوئی حُسن کی سرکار سے پوچھے

ہم بندۂ تسلیم و رضا ہیں کہ نہیں ہیں؟

مُدت سے لئے پھرتا ہوں اک سجدۂ بیتاب

اُن سے کوئی پوچھے۔ وہ خدا ہیں کہ نہیں ہیں؟

جلوے کی طلب پیروئ حضرتِ موسیٰ

گمراہ مرے راہنما ہیں۔ کہ نہیں ہیں؟

اتنا تو ہوا آہِ شبِ غم کے اثر سے

فطرت کا جگر پھوٹ بہا چشمِ سحر سے

اُمید نے بھی یاس کے مُردوں کو پکارا
آئی کوئی آواز نہ دل سے نہ جگر سے

ناصح کو بلاؤ مرا ایمان سنبھالے
پھر دیکھ لیا اُس نے لگاوٹ کی نظر سے

اے خندۂ گلشن۔ یہ ہے انجام شب عیش
گُل روتے ہیں مُنہ ڈھانپ کے دامان سحر سے

ایک ایک قدم پر ہے جہاں خندۂ تقدیر
تدبیر گزرتی ہے اُسی راہ گزر سے

خورشید قیامت کی طرف دیکھ رہا ہوں
ملتی ہوئی صورت ہے مرے داغ جگر سے

کچھ شان کریمی نے اس انداز سے تولا
بھاری ہی رہا دیدۂ تر دامن تر سے



ارمان فرطِ ضبط سے پُر جوش ہو گئے
آخر یہ فتنے محشر خاموش ہو گئے

آ کر عدم سے بھول گئے وعدہ الست
میخانۂ حیات میں مدہوش ہو گئے

بُود و نبُود اس کے سوا اَور کچھ نہیں
ہشیار ہو گئے کبھی بے ہوش ہو گئے

او بے نصیب حشر کے وعدے کا حشر دیکھ
وہ رفتہ رفتہ وعدہ فراموش ہو گئے

سامانِ ضبط ہی نہ رہا پردہ دارِ ضبط
حسرت فروشِ غم لبِ خاموش ہو گئے

دل میں ہجومِ یاس ہے بیٹھے ہیں دم بخود
اب ہم بھی ایک محفلِ خاموش ہو گئے

للہ پھیر لے اسے اے قاسمِ ازل

دل لے کے ہم تو فتنۂ در آغوش ہو گئے

بے موسمی کا شغل تھا اپنی نماز بھی
فصل بہار آ گئی مے نوش ہو گئے

بے ربطیٔ فسانہ کا اب تذکرہ ہی کیا
خاموش تم نے کر دیا خاموش ہو گئے

طوفاں اُٹھائے پھرتے تھے ہوش و خرد حفیظ
دیکھی جنوں کی شکل تو خاموش ہو گئے

حیرت انگیز ہے نقّاش ازل کے ہاتھوں
میری تصویر کا تصویرِ فنا ہو جانا

دستِ تقدیر میں شمشیرِ جفا دیتا ہے
خود بخود بندۂ تسلیم و رضا ہو جانا

اس کی اُفتاد پہ خورشید کی رفعت قرباں

جس کو بھایا ترا نقشِ کفِ پا ہو جانا

شوخیِ باد ہوئی باعثِ تعمیرِ حباب

یعنی ہستی ہی میں رکھّا ہے فنا ہو جانا

رونقِ بزم ہے شیون سے۔ تو شیون ہی سہی

ہمصفیرانِ چمن۔ پھر نہ خفا ہو جانا

داورِ حشر کا انصاف اشارے ان کے

بس یہی ہے کسی بندے کا خدا ہو جانا

یہاں جز کشتیِ موجِ بلا کچھ بھی نہ پاؤ گے

اسی میں بیٹھ کر دریائے ہستی سے اُتر جانا

حباب آسا مٹے سب ولولے جوشِ جوانی کے

غضب تھا قلزمِ اُمّید کا چڑھ کر اُتر جانا

بُری حالت بُری شے ہے۔ کہ ہم نے دوست دُشمن کو

نہ سمجھا تھا۔ مگر سمجھا۔ نہ جانا تھا۔ مگر جانا

مبادا پھر اسیرِ دامِ عقل ہوش ہو جاؤں
جنوں کا اس طرح اچھا نہیں حد سے گزر جانا

مجھے ڈر ہے گلوں کے بوجھ سے مرقد نہ دب جائے
انہیں عادت ہے جب آنا ضرور احسان دھر جانا

کشتیٔ عمر کنارے سے لگی آخر کار
موت کے گھاٹ اُترتے ہیں اُترنے والے

دل حسینوں سے بچانا ہے اگر۔ آنکھ نہ کھول
اسی زینے سے اُترتے ہیں اُترنے والے

ہاں سنو میرا فسانہ۔ ابھی قائم ہیں حواس
کوئی دم میں ہیں یہ اوراق بکھرنے والے

ہستیٔ گل کی حقیقت ۔ بس یہی اک دو ورق
ہستیٔ بلبل کی حالت ۔ بس یہی دو چار پر
اُس نفس کی اُستواری کا شکستن پر مدار
تار و پُودِ زندگی ہے جس نفس کے تار پر



حیران نہ ہو دیکھ میں کیا دیکھ رہا ہوں
حواہ بھیوان بندے ! تری صورت میں خدا دیکھ رہا ہوں
وہ اپنی جفاؤں کا اثر دیکھ رہے ہیں
میں معنیٔ تسلیم و رضا دیکھ رہا ہوں
دزدیدہ نگاہوں سے کسے دیکھ رہے ہو؟
کیا بات ہے ! یہ آج میں کیا دیکھ رہا ہوں
ہے حسن یہی شے تو گمان اور نہ کیجے
سودا نہیں مطلوب ذرا دیکھ رہا ہوں

کس طرح نہ قائل ہوں دعائے سحری کا
اُس لب پہ تبسم کی ضیا دیکھ رہا ہوں
کیوں ارضِ وطن تنگ ہے۔ یہ بات ہی کیا ہے؟
اب تو فقط اک قبر کی جا دیکھ رہا ہوں
مر جانے کی دھمکی ہوئی تمہیدِ تماشا
میں نے کہا دیکھ۔ اس نے کہا دیکھ رہا ہوں

وہ ہوئے پردہ نشیں انجمن آرا ہو کر
رہ گیا میں ہمہ تن چشمِ تمنا ہو کر
حسن نے عشق پہ حیرت کی نگاہیں ڈالیں
خود تماشا ہوئے ہم محوِ تماشا ہو کر
آنکھ کمبخت سے اس بزم میں آنسو نہ رُکا
ایک قطرے نے ڈبویا مجھے دریا ہو کر

کوئی ہو دردِ محبّت کا مداوا کر دے
ملک الموت ہی آجائے مسیحا ہو کر

کچھ تعجب نہیں کعبے میں اگر جی نہ لگے
آئے ہیں ہم طرفِ دیر و کلیسا ہو کر

حسنِ ظاہر پہ نگاہیں نہ کبھی للچائیں
مجھ کو دُنیا نظر آتی رہی دُنیا ہو کر

رنگ بدلا یار کا وہ پیار کی باتیں گئیں
وہ ملاقاتیں گئیں وہ چاندنی راتیں گئیں

پی تو لیتا ہوں مگر پینے کی وہ باتیں گئیں
وہ جوانی۔ وہ مستی۔ وہ برساتیں گئیں

اللہ اللہ کہہ کے بس اک آہ کرنا رہ گیا
وہ نمازیں۔ وہ دعائیں وہ مناجاتیں گئیں

حضرتِ دل ہر نئی اُلفت سمجھ کر سوچ کر
اگلی باتوں پر نہ بھُولیں آپ وہ باتیں گئیں

راہ و رسمِ دوستی قائم تو ہے۔ لیکن حفیظ
ابتدائے شوق کی لمبی ملاقاتیں گئیں



بے تعلق زندگی اچھی نہیں
زندگی کیا۔ موت بھی اچھی نہیں

دل لگاؤ تو لگاؤ دل سے دل
دل لگی ہی دل لگی اچھی نہیں

ہوش میں آ۔ او دلِ خانہ خراب
دل بروں سے دل لگی اچھی نہیں

نا اُمیدی کا ہوا دل میں قیام
شیشہ اچھا ہے پری اچھی نہیں

یہ ہوا یہ ابر یہ سبزہ حفیظ
آج پینے میں کمی اچھی نہیں

جلوۂ حسن کو محروم تماشائی کر
بے نیازی صفتِ لالۂ صحرائی کر
ہاں بڑے شوق سے شمشیر کے اعجاز دکھا
ہاں بڑے شوق سے دعوائے مسیحائی کر
میں تو مجبور ہوں عادت سے کہے جاؤں گا
تو کوئی بات نہ سن اور نہ پذیرائی کر
اپنے بیمار کی یہ آخری امید بھی دیکھ
ملک الموت سے کہتا ہے مسیحائی کر
مجھ کو بیجا کے در یار پہ قاصد نے کہا
خامہ فرسائی نہ کر ناصیہ فرسائی کر

ہم تری صورتِ انکار کو پہچانتے ہیں
وہ تبسّم تو شریکِ لبِ گویائی کر



دو روز میں شباب کا عالم گزر گیا
"بدنام کرنے آیا تھا بدنام کر گیا"
بیمارِ غم مسیح کو حیران کر گیا
اُٹھا۔ جُھکا۔ سلام کیا۔ گر کے مر گیا
گزُرے ہوئے زمانے کا اب تذکرہ ہی کیا
اچھّا گزر گیا۔ بہت اچھّا گزر گیا
دیکھو یہ دل لگی۔ کہ سرِ رہگزارِ حسُن
اک اک سے پوچھتا ہوں مرا دل کدھر گیا
اے چارہ گر منا مرے تیغ آزما کی خیر
اب دردِ سر کی فکر نہ کر۔ دردِ سر گیا

اے میرے رونے والو خدارا جواب دو
وہ بار بار پوچھتے ہیں کون مرگیا ؟

شاید سمجھ گیا مرے طولِ مرض کا راز
اب چارہ گر نہ آئے گا۔ اب چارہ گر گیا

جلوہ دکھا کے چھُپ گیا وہ شوخ اور ہمیں
وقفِ نزاعِ مسجد و بُت خانہ کر گیا

اب ابتدائے عشق کا عالم کہاں حفیظ
کشتی مری ڈبو کے وہ دریا اُتر گیا

عاشق سا بدنصیب کوئی دوسرا نہ ہو
معشوق خود بھی چاہے تو اس کا بھلا نہ ہو

ہے مُدعائے عشق ہی دُنیائے مُدّعا
یہ مُدّعا نہ ہو تو کوئی مدّعا نہ ہو

عبرت کا درس ہے مجھے۔ ہر صورتِ فقیر
ہوتا ہے یہ خیال کوئی بادشا نہ ہو

پایانِ کار موت ہی آئی بروئے کار
ہم کو تو وصل چاہیئے کوئی بہانہ ہو

کعبے کو جا رہا ہوں ۔ نگہ سوئے دیر ہے
پھر پھر کے دیکھتا ہوں کوئی دیکھتا نہ ہو

ہاں اے حفیظ چھیڑتا جا نغمہ ہائے وقت
جب تک ترا ربابِ سخن بے صدا نہ ہو

بُتوں نے یا خدا نے مار ڈالا
محبّت کے بہانے مار ڈالا

مسیحا کو نہ آنا تھا نہ آئے
قضا آئی قضا نے مار ڈالا

رہے اُن کے بہانے ہی بہانے
بہانے ہی بہانے مار ڈالا
بتو کیوں قتل سے کرتے ہو پرہیز؟
اگر مجھ کو خدا نے مار ڈالا؟
محبّت کو مرض سمجھے ہوئے تھے
طبیبوں کی دوا نے مار ڈالا
کہا یہ سُن کے ذکرِ مرگِ دُشمن
کسی کی بد دعا نے مار ڈالا
ارے یہ ظلم! ارے یہ سرد مہری
زمانے! او زمانے! مار ڈالا!!



اظہارِ حقیقت کوئی دُشوار نہ کر دے
پابندِ رسوم رسن و دار نہ کر دے

یہ حسن کہیں عشق کو بیزار نہ کر دے
دنیا کی حقیقت سے خبردار نہ کر دے
دل گرمیِ اُمید کا اظہار نہ کر دے
مجھ کو بھی گنہگار گنہگار نہ کر دے
اے داورِ حشر اس سے نہ کر پرسشِ ایماں
انکار کا عادی کہیں انکار نہ کر دے



تقاضا موت کا ہے اَور میَں ہوں
بزرگوں کی دعا ہے اَور میں ہوں
اُدھر دُنیا ہے اور دُنیا کے بندے
ادھر میرا خدا ہے اَور میَں ہوں
انا الحق طالبِ دار و رسن ہے
پُرانا ادّعا ہے اَور میَں ہوں

نہ پوچھو حال میرا کچھ نہ پوچھو
کہ تسلیم و رضا ہے اَور میں ہوں
ہزاروں کام جو بگڑے ہوئے ہیں
مگر شکرِ خدا ہے اَور میں ہوں
حفیظ آلامِ فرقت کی نہ پوچھو
محبّت کی سزا ہے اَور میں ہوں



دار بھی پیشِ نظر دعوئے منصور بھی ہے
یہ وہ منزل ہے۔ کہ نزدیک بھی ہے دُور بھی ہے
وقتِ رخصت مری آنکھوں کی سفیدی پہ نہ جا
چہرۂ صبح پہ دیکھو تو کہیں نُور بھی ہے
کہیں پابندِ نیاز اور کہیں خسروِ ناز
ایک ہستی ہے۔ کہ مختار بھی مجبور بھی ہے

مٹایا تو نے مجھ کو جوشِ ایماں دیدہ خواہد شد
صنم کہتے ہیں جا ہو جا مسلماں دیدہ خواہد شد

ہوا ہے فصلِ گُل کے ساتھ ہی دورانِ خوں رخصت
پھر اگلے سال اے خارِ مغیلاں دیدہ خواہد شد

بہار آنے تو دو ہوش و خرد جانے تو دو ٹھہرو
گلستاں دیدہ خواہد شد بیاباں دیدہ خواہد شد

فلک کہتا ہے انساں محو ہے۔ تو آرزوؤں میں
بنا بیٹھا ہے پریوں میں سلیماں دیدہ خواہد شد

ہمارے ہی عزیزوں سے تجھے ہوا اختلاط ایسا
ہمیں سے نفرت اے مرگِ عزیزاں دیدہ خواہد شد



وہ قافلہ آرام طلب ہو بھی تو کیا ہو؟
آوازِ تنفس جیسے آوازِ درا ہو

خاموش ہو کیوں دعوئے اُلفت کے گواہو؟
محشر تو بپا ہو۔ میرے نالو میری آہو
اس دارِ فنا میں مری ہستی کوئی دیکھے
اک دم کا بھروسا ہے جو اک دم میں فنا ہو

عشق نے عقل کو دیوانہ بنا رکھا ہے
فکرِ انجام کی اُلجھن میں پھنسا رکھا ہے
اُٹھ کے بالیں سے۔ مرے دفن کی تدبیر کرو
نبض کیا دیکھتے ہو نبض میں کیا رکھا ہے؟
میری قسمت کے نوشتے کو مٹا دے کوئی
مجھ کو قسمت کے نوشتے نے مٹا رکھا ہے
آپ بیتاب نمائش نہ کریں جلووں کی
ہم نے دیدار قیامت پہ اُٹھا رکھا ہے

حال میرا نزع تک نوعِ دگر ہوتا گیا
نوحہ گر ہوتا گیا جو چارہ گر ہوتا گیا

ضعف سے ساری اُمیدیں خاک میں ملتی گئیں
آہ بے تاثیر۔ نالہ بے اثر ہوتا گیا

عیش میں لذّت کے بدلے ذلّتیں ملتی گئیں
نفع بھی ہوتا گیا۔ جتنا ضرر ہوتا گیا

زندگی کی منزلوں میں جس قدر آگے بڑھے
دل کشی کے ساتھ رستہ پُر خطر ہوتا گیا

دردِ دل کہتا گیا مَیں اور وہ سُنتے گئے
حلق ادھر خُشک اور اُدھر رومال تر ہوتا گیا

باغِ ہستی میں عجب شے ہے نہالِ آرزُو
جس قدر بڑھتا گیا یہ بے ثمر ہوتا گیا

وقتِ پیدائشِ جو گریہ تھا۔ بدستور اب بھی ہے

ابتدا میں جو ہوا۔ وہ عمر بھر ہوتا گیا



جلووں کا تقاضا ہے۔ جلنے کا تہیا ہے
یہ دل ہے کہ ہوسلے ہے۔ سینہ ہے کہ سینا ہے؟
اُس جلوے کی ماہیت معلوم نہیں کیا ہے
جو خود ہی تماشائی۔ جو خود ہی تماشا ہے
اے حسرتِ ناکامی۔ تیرا ہی بھروسا ہے
تو جانِ تمنّا ہے۔ ایمانِ تمنّا ہے
فطرت کی قلمکاری گلشن جسے کہتے ہیں
اک گُل کے تبسم کا بگڑا ہوا نقشا ہے
کچھ راز نہیں کُھلتا دزدیدہ نگاہی کا
اب تو مرے سینے میں دل ہے نہ تمنّا ہے
آبادی ہی آبادی۔ بربادی ہی بربادی

وہ حُسن کا عالم ہے۔ یہ عشق کی دُنیا ہے
اے بے خودئ حیرت۔ یہ بھی نہ کھُلا تجھ پر؟
موسےٰ ہے کہ جلوا ہے۔ جلوا ہے کہ موسےٰ ہے
بستی ہمہ بربادی صحرا ہمہ آبادی
یہ عشق کی دُنیا ہے۔ کیا عشق کی دُنیا ہے!
تیری یہ کثیف آنکھیں۔ اور حُسن کا نظّارا!
بے تاب نہ ہو غافل۔ جلوا نہیں پردا ہے!
عاشق ہے حفیظ آخر نفرت نہ کرو اس سے
انسان کی صورت ہے۔ اللہ کا بندا ہے

اُمیدیں آرزوئیں کھیلتی ہیں یوں مرے دل سے
پلٹ جاتی ہیں موجیں جس طرح ٹکرا کے ساحل سے
مرے مر مر کے جی اُٹھنے پہ کیوں اتنا تعجب ہے

کہ ہوں دلدادۂ غربت پلٹ آتا ہوں منزل سے
شکونِ زندگی حاصل ہوا ترکِ عمل کر کے
نہ خوش ہوتا ہوں آساں سے نہ گھبراتا ہوں مشکل سے
بنانے والے۔ شاید تیرا کوئی خاص مقصد تھا
مری پھوٹی ہوئی تقدیر سے ٹوٹے ہوئے دل سے
سرِ مقتل حفیظ اپنا کوئی ہمدم نہ تھا۔ لیکن
نگہ کچھ دیر تک لڑتی رہی شمشیرِ قاتل سے

ارادہ تھا۔ کہ سیرِ گلشنِ ایجاد کرتے ہیں
کہ اتنے میں اجل آکر پکاری یاد کرتے ہیں
ہجومِ آرزو سے شہرِ دل آباد کرتے ہیں
ہم اپنی خاک اپنے ہاتھ سے برباد کرتے ہیں
طرفداری نہ کر۔ انصاف کر اے داورِ محشر

سزا دے ان بتوں کو ورنہ ہم فریاد کرتے ہیں
کبھی تو رنگ لائے گا کبھی تو گل کھلائے گا
ہم اپنا خون صرفِ گلشنِ ایجاد کرتے ہیں
جہاں کو کارپردازانِ قدرت کھیل سمجھے ہیں
کبھی آباد کرتے ہیں کبھی برباد کرتے ہیں
کسی اُمید پر زندہ رہوں یا گھُٹ کے مرجاؤں
وہ کیا کہتے ہیں اے قاصد۔ وہ کیا ارشاد کرتے ہیں؟

برہمن جس دن عدو کے ماؤمن ہو جائے گا
شیخ بُت خانے میں جا کر برہمن ہو جائے گا
عشق پھر کرنے لگا دعوٰے انا المنصور کا
پھر زباں زدِ قصّہ دار و رسن ہو جائے گا
دہر کی بے مائگی ہی سے نہ رہ مجبورِ زیست

مر بھی جا۔ ہوجائیگا گورو کفن ہو جائے گا

روح و تن نے مل کے خود رکھی تھی بُنیادِ وصال
یہ خبر کیا تھی فراقِ روح و تن ہوجائے گا

عشق کے انصاف پر فرہاد بھی حیران ہے
یہ خبر کیا تھی کہ تیشہ کوہکن ہو جائے گا

ذرا انصاف کرو میری حالت دیکھنے والے
کہیں دیکھے بھی ہیں ایسی مصیبت دیکھنے والے

مٹائے لوحِ دل سے یاس نے احساس کے نقشے
مجھے نادم نہ کر نقشِ ندامت دیکھنے والے

اُٹھا رکھا ہے میں نے آپکا دیدار محشر پر
مرا مُنہ تک رہے ہیں میری ہمت دیکھنے والے

لگا یا اس لئے آئینہ اُس نے روزنِ در میں

کہ اپنا مُنہ تو دیکھیں میری صورت دیکھنے والے

بعمر ۱۶ سال

ہوئی وجہ الم سیرِ بہارِ گلستاں مجھ کو
سُنائی پتّے پتّے نے خزاں کی داستاں مجھ کو
الٰہی کیا اسی کا نام سوزِ دردِ اُلفت ہے
نہ تابِ ضبط ہے مجھ کو نہ یارائے فغاں مجھ کو
یہی ہے حشر تو اس ساحری کو کون مانے گا
کہ جھُٹلاتے ہیں خود میری زباں میرا بیاں مجھ کو
وفورِ بے خودی نے مرحلے طے کر دئے سارے
کہ اپنا ہی مکاں اب ہو گیا ہے لامکاں مجھ کو

رکھتی تھی لاگ میرے گریباں سے نوبہار
دامن گلوں کے باغ میں کیوں چاک ہو گئے؟

دیدوں نے کھوئی ضبطِ محبت کی آبرو
کم بخت اُن کے سامنے نمناک ہوگئے



دیکھ اے رحمتِ حق میرے گلے سے نہ لپٹ
میں گنہگار ہوں آلودہ ہے دامن میرا
کب سے پابندِ قفس ہوں مجھے معلوم نہیں
شاخِ سدرہ پہ کسی دن تھا نشیمن میرا
رُوح کو خاک کے دامن میں لئے بیٹھا ہوں
میرا قالب ہی حقیقت میں ہے مدفن میرا
گردنِ غیر میں ہیں ہاتھ حمائل اُن کے
ہاں گلا گھونٹ کمندِ رگِ گردن میرا
جانبِ کعبہ تو چلتا ہوں۔ مگر یا اللہ!
بُتکدہ میرا! صنم میرے!! برہمن میرا!!!

نہ لگاؤ ہے کسی سے نہ مجھے لاگ حفیظؔ
دوست میرا کوئی دُنیا میں نہ دُشمن میرا

اے برہمن مجھے زنّار سے کیا کام ابھی
میری گردن میں تو ہے رشتۂ اسلام ابھی
اپنے آغازِ محبّت پہ ہنسی آتی ہے
دل کو رہ رہ کے ہے اندیشۂ انجام ابھی
قیس و فرہاد پہ موقوف نہیں۔ کیا معلوم
دربدر کس کو پھرائے ہوسِ خام ابھی

زباں کی دسترس پہنائے دامانِ بیاباں تک ہے
یہ دل ہی جانتا ہے وسعتِ معنی کہاں تک ہے
غمِ منزل نشانِ نقشِ پائے رہرواں تک ہے

تلاش کاروانِ مُشکل سُراغِ کارواں تک ہے
دگرگوں ہے زمانہ میکشوں کی خیر ہو یارب
ہوا خواہِ طریقِ محتسب پیرِ مغاں تک ہے
مذاقِ اہلِ بینش پر ہنسی آتی ہے اب مجھ کو
کہ برہم خندۂ گل سے مزاجِ باغباں تک ہے

مضحکہ آؤ اُڑائیں عشقِ بے بُنیاد کا
اک جُدا مدفن بنائیں تیشۂ فرہاد کا
واہ وا کیا رنگ بدلا گلشنِ ایجاد کا
سایۂ گُل پر گماں ہونے لگا صیّاد کا
بہ چلا ہے اشکِ حسرت ہاں مدد اے برقِ یاس!
یہ بھی اک دانہ ہے میرے خرمنِ برباد کا
کس نگاہِ گرم سے دیکھا ہے اس نے وقتِ قتل

آہ ٹھنڈی پڑ گئی ۔ دم گھُٹ گیا فریاد کا
غُنچۂ غنچہ خوف سے مجھ کو نظر آیا قفس
پتّے پتّے پر ہوُا دھوکا کفِ صیّاد کا
ہو نہ احساسِ اسیری تو رہائی ہے محال
ایسے قیدی نام تک لیتے نہیں میعاد کا
ضعف کی یہ ہمّتیں ہیں ناتوانی کا یہ زور
ٹکڑے ٹکڑے کردیا دامن مری فریاد کا

مری بے مایگی شرما رہی ہے اہلِ گلشن سے
کبھی بجلی نہ آسودہ گئی میرے نشیمن سے
وہ روز آتے ہیں پہروں بیٹھ کر آنسو بہاتے ہیں
الٰہی کونسا فتنہ اُٹھے گا میرے مدفن سے
مثالِ گردِ دیں بھی آج سرگرمِ تعاقب ہوں

کہ اُترے گا کہیں تو شہسوارِ نازتوسن سے



میں وہ برگِ خزاں دیدہ ہوں اس گلزارِ ہستی میں
بگولے جس کے شائق جس پہ عاشق بادِ صرصر ہو
یہی نازک دماغی باعثِ رُسوائیِ گُل ہے
صبا کی اک ذرا سی چھیڑ میں جامے سے باہر ہو



مجازعین حقیقت ہے باصفا کے لئے
بُتوں کو دیکھ رہا ہوں فقط خدا کے لئے
اثر میں ہو گئے کیوں سات آسماں حائل؟
ابھی تو ہاتھ اُٹھے بھی نہیں دعا کے لئے
ہوا بس ایک ہی نالے میں دم فنا اپنا
یہ نازیانہ تھا عمرِ گریز پا کے لئے

الٰہی عشق کا انجام کار کیا ہوگا
کہ ابتدا ہی سے ہے فکر انتہا کے لئے

اُسی کو راہ دکھاتا ہوں جو مٹائے مجھے
میں ہوں تو نور۔ مگر چشمِ نقشِ پا کے لئے

یہ جانتا ہوں۔ کہ ہے نصفِ شب۔ مگر ساقی
ذرا سی چاہیئے اک مردِ پارسا کے لئے



نہ جب تک جلوۂ کُن واقفِ قندیلِ امکاں تھا
نہ یوں صورت سے روشن تھا۔ نہ یوں معنی میں پنہاں تھا

غضب کا عبرت افزا انقلابِ چرخِ گرداں تھا
ابھی اک شور برپا تھا۔ ابھی اک ہُو کا میداں تھا

اُمید و یاس کی روداد ہے اُلفت کا افسانہ
کبھی جینے کے ارماں تھے کبھی مرنے کا ساماں تھا

وفورِ اشک نے آخر حقیقت کھول دی دل کی
اسی کوزے میں دریا تھا۔ اسی قطرے میں طوفاں تھا

کبھی چشمِ بصیرت سے نہ دیکھی سرزمینِ دل
یہاں کا ذرّہ ذرّہ آفتابِ اوجِ عرفاں تھا

ہوئی یہ رات بھر میں خندہ ہائے عیش کی صورت
چمن کا غنچہ غنچہ صبح کو اک چشمِ گریاں تھا

بتوں کے عشق میں کیونکر پھنسا۔ اب یہ خدا جانے
بظاہر تو ہمارا دل بڑا پکا مسلماں تھا

ہوائے جاہ و دولت وجہِ ناکامی ہوئی ورنہ
ہمارا بوریائے بے ریا تختِ سلیماں تھا

بہارِ آرزو کیسی ہے خزانِ یاس کے دن ہیں
ہمارا خطّۂ دل۔ ہاں کبھی گلشن بداماں تھا

وہی کپڑا۔ خرد کے لب پہ جس کا نام داماں تھا
جنوں کے ہاتھ سے اک دن گریباں ہی گریباں تھا

یہ دشتِ نجد میں پایا سُراغِ قیس لیلےٰ نے
کہیں دامن کا ٹکڑا تھا کہیں تارِ گریباں تھا

مجھے برہم سمجھ کر جو مئے کو پی گیا واعظ
وگرنہ آج میرا ہاتھ تھا اس کا گریباں تھا



فکرِ امراض ہمیں۔ موت کا دھڑکا ہم کو
روز کی کشمکشِ زیست نے مارا ہم کو

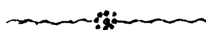
بس کر اے بیخودیٔ ذوقِ ندامت بس کر
بھول جائے نہ غمِ دوش میں فردا ہم کو

جاؤ ہاں جاؤ رقیبوں کی مرادیں بر لاؤ
رہنے دو رہنے دو ناکامِ تمنّا ہم کو

ہے ابھی دُور۔ بہت دُور ہماری منزل
دشتِ وحشت تو ہے اک راہ کا کانٹا ہم کو

وہ نگہ باندھ گئی دل میں طلسمِ اُمّید
نظر آتی ہے تمنّا ہی تمنّا ہم کو

شہرِ اُلفت میں کوئی تفرقہ پرداز نہیں
کہیں کعبہ نظر آیا نہ کلیسا ہم کو



اُلفت ہوئی۔ ہوئی۔ وہ ہؤا بے وفا۔ ہؤا
اچھا ہؤا۔ بُرا ہؤا۔ جو کچھ ہؤا ہؤا

رزاقِ دو جہاں کے خزانے کو کیا ہؤا
ملتا ہے رنج وہ بھی کسی کا دیا ہؤا

بیمارِ غم کی پوچھتے ہو سرگزشت کیا
اک آہ کی غریب نے اور دَم ہَوا ہؤا

بس دُور ہی سے زندگیِ خضر کو سلام
زہرآبِ غم ہے آبِ بقا میں ملا ہوا
پھر مُردہ آرزوؤں میں اک رُوح پھونک دی
گزرا پھر اس طرف سے کوئی دیکھتا ہوا

غمّاز بن گئے ہیں۔ آنسو غمِ نہاں کے
آنکھوں سے گر رہے ہیں ٹکڑے میری فغاں کے
آنکھوں میں آبسے ہیں سب حوصلے زباں کے
اب اختتام پر ہوں۔ میں اپنی داستاں کے
میری سیاہ بختی۔ پہلو نکالتی ہے
ہر نفع میں ضرر کے۔ ہر سود میں زیاں کے
با ایں ہمہ کُہولت۔ یہ پیرزالِ دُنیا
پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ہر ایک نوجواں کے

انگڑائی لے رہا ہے بیمارِ غم کسی کا
پر تُل رہے ہیں گویا اُڑنے کو مرغِ جاں کے



عشق میں چھیڑ ہوئی دیدۂ تر سے پہلے
غم کے بادل جو اُٹھے تو یہیں برسے پہلے
ہاتھ رکھ رکھ کے وہ سینے پہ کسی کا کہنا
دل سے درد اُٹھتا ہے پہلے کہ جگر سے پہلے
دل کو اب آنکھ کی منزل میں بٹھا رکھیں گے
عشق گزرے گا اسی راہ گزر سے پہلے
وہ ہر اک وعدے سے انکار بطرزِ اقرار
وہ ہر اک بات پہ ہاں لفظِ مگر سے پہلے
چاک دامانیِ گُل کا ہے گلہ کیا بُلبُل
کہ اُلجھتا ہے یہ خود بادِ سحر سے پہلے

کچھ سمجھدار تو ہیں نعش اُٹھانے والے
لے چلے ہیں مجھے اس راہگذر سے پہلے

دُنیا کے حُسن و عشق میں یہ امتیاز ہے
اک ہے نیاز مند۔ تو اک بے نیاز ہے
سچ پوچھیئے تو نیستی ہستی کا راز ہے
جو سر چڑھا ہے دار پہ وہ سرفراز ہے
کچھ ہوش ہے تو چشمِ حقیقت نگر سے دیکھ
محمود ذرّے ذرّے میں حُسنِ ایاز ہے
ٹوٹے تو موت ہی سے یہ ٹوٹے گا سلسلہ
ورنہ شبِ فراق کی رسی دراز ہے
یہ بھی کمالِ عشق کی ہیں بے نیازیاں
جو تھا نیاز مند وہی بے نیاز ہے

(بعمر ۱۶ سال)

فلک سے آج شورِ نعرۂ مستانہ آتا ہے
کوئی مینوش باد ل جانبِ میخانہ آتا ہے
لحاظِ خاطرِ احبابِ دیرینہ ہے اے زاہد
چلوں کیا سوئے مسجد راہ میں میخانہ آتا ہے
یہ کس کی جستجو میں آج مجنوں بن گئی لیلےٰ
یہ کیا ہے آج ناقہ جانبِ میخانہ آتا ہے

بعمر ۱۵ سال

مجھے ہے گردشِ پیمانہ گویا گردشِ قسمت
کہ آیا محتسب بھی ساتھ جب جامِ شراب آیا
ہزاروں باوفا معشوق ہیں لیکن مری قسمت
جب آیا بے وفاؤں پر دلِ خانہ خراب آیا
نظر آتا ہے کچھ بدلا ہوا سا رنگ عالم کا
حفیظ اک دو برس میں دیکھ لینا انقلاب آیا

بعمر ۱۶ سال

ذرا دم لے۔ کوئی ساعت ٹھہر اے مرگِ مایوسی
تمنّا ہے۔ کہ ان سے آخری اک آرزو کرلوں
وہ آوازِ اذاں آئی۔ ہوا وقتِ نماز۔ اچھا
جنابِ شیخ چلئے سوئے مسجد میں وضو کرلوں
حفیظ آسان ہے ترکِ وفا میرے لئے لیکن
زمانے بھر کی لعنت کس لئے طوقِ گلو کرلوں

بعمر ۱۷ سال

دوستی کا چلن رہا ہی نہیں
اب زمانے کی وہ ہوا ہی نہیں
حال یہ ہے کہ ہم غریبوں کا
حال تم نے کبھی سُنا ہی نہیں
کیا چلے زور دستِ وحشت کا
ہم نے دامن کبھی سیا ہی نہیں

دوست بھی دوستی نہیں کرتے
دشمنوں کا تو کچھ گلا ہی نہیں

بعمر ۱۵ سال

کم بخت دل بُرا ہو تری آہ آہ کا
لے وہ بھی آنا ترک ہوا گاہ گاہ کا
یارب بیان سُن لیا دل سے گواہ کا
اب رحم پر معاملہ ہے دادخواہ کا
چھیڑو نہ میٹھی نیند میں اے منکر و نکیر
سونے دو بھائی۔ میں تھکا ماندہ ہوں راہ کا
میرے مقلدوں کو مری راہِ شوق میں
ہر گام پر نشان ملا سجدہ گاہ کا
کس مُنہ سے کہہ رہے ہو۔ ہمیں کچھ غرض نہیں
کس مُنہ سے تم نے وعدہ کیا تھا نباہ کا

دل لینے والی بات اسی دل سے پوچھئے
مالک یہی ہے میرے سفید و سیاہ کا
دل میں کھنچا ہے نقشۂ توحید اے حفیظ
نعرہ ہے لب پہ اشہدُ ان لا الٰہ کا

بعمر ۱۴ سال

قہر آلودہ ہے چشمِ ساقیِٔ مستانہ آج
ہو گیا لبریز کس کی عمر کا پیمانہ آج
کوئی پہلو میں نہیں ویرانہ ہے میخانہ آج
گردشِ قسمت ہے گویا گردشِ پیمانہ آج
محتسب کا ہائے پھر دستِ تعدی ہے دراز
ہائے پھر ٹوٹے پڑے ہیں شیشہ و پیمانہ آج

بعمر ۱۷ سال



یہ کس نے بجلیاں بھر دی ہیں یارب میرے شیون میں
لگے آگ اس محبّت کو لگا دی آگ سی تن میں
نہ کرنا بھول کر رُخ اُس طرف اے ناقۂ لیلےٰ
غبارِ قیس پھیرتا ہے ابھی تک نجد کے بَن میں۔
پڑی ہے ٹھوکریں کھانے کو اُس ظالم کے کوچے میں
یہ کہدو اُٹھ کے آجائے قیامت میرے مدفن میں
اسی سے لوگ جیتے ہیں۔ اسی سے لوگ مرتے ہیں
یہ کیا اعجاز کیا جادو ہے چشمِ سامری فن میں
بعمر ۱۶ سال

نہ چھیڑ اے ہمنشیں ہم ہیں خیالِ روئے دلبر میں
برسنے کو بھرے بیٹھے ہیں بادل دیدۂ تر میں
نہیں نیت جنابِ شیخ! جن کی حوضِ کوثر میں
وہ جلوا دیکھتے ہیں دو جہاں کا ایک ساغر میں

ازل میں لینے والے عیش و عشرت لے گئے سارا
زمانے بھر کی ناکامی رہی میرے مقدر میں

یہ کس خورشید رو نے اپنے چہرے سے نقاب الٹا
یہ کس کے پرتوِ رُخ نے لگا دی آگ محشر میں

خدا کے واسطے دیکھو مؤذن وصل کی شب ہے
چُھری چل جائے گی مجھ پر تری اللہ اکبر میں

سزائے معصیت اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی
الٰہی سیکشوں کو غرق کر دے حوض کوثر میں

بعمر ۱۵ سال

جان جاتی ہے گھڑی بھر کے لئے اور نہ جاؤ
جاتے جاتے یہ مری جان یہ احساں ہوگا

کب مٹائے سے مٹا داغ سیہ کاری کا
صورتِ مہر سرِ حشر نمایاں ہوگا

دامنِ وحشت وغبارِ دلِ لیلیٰ ہے لباس
لاکھ عُریاں ہو مگر قیس نہ عُریاں ہوگا
بعمر ۱۵ سال

چلی ہے جانِ یارِ رفتگاں میں
مسافر ہے تلاشِ کارواں میں

مدتوں تک جو پڑھایا کیا اُستاد مجھے
عشق میں بھول گیا کچھ نہ رہا یاد مجھے
بعمر ۱۴ سال

پھر خاک اُڑاتے ہوئے پھرتے ہیں بگولے
پھر دشت میں مٹی ہوئی برباد کسی کی
پھر بابِ اثر کا کہیں رستہ نہیں ملتا
پھر بھٹکی ہوئی پھرتی ہے فریاد کسی کی
بعمر ۱۴ سال

وہ ہم نہیں کہ مریں عمرِ جاوداں کے لئے
دعائیں مانگتے ہیں مرگِ ناگہاں کے لئے

فلک کو ہجر کی شب بادلوں نے ڈھانپا ہے
یہ انتظام ہوئے ہیں مری فغاں کے لئے

(بعمر ۱۶ سال)

وہ گرمِ سیرِ گلستاں اُدھر رقیب کے ساتھ
اِدھر ہے پائے نگہ اور وادیِ پُرخار

سُنتا ہوں جہنم کی سزا میرے لئے ہے
میں ایسا گنہگار یہ کیا میرے لئے ہے

کہا شیریں نے رو کر لاشۂ فرہاد کے آگے
یہی اے پیرزن آئے تری اولاد کے آگے

اب شعر و شاعری کے زمانے کہاں رہے — وہ اور لوگ تھے جو مرے ہم زباں رہے

اُٹھ اُٹھ کے بیٹھ بیٹھ گئے پھر رواں رہے — ہم گرد کی طرح سے پسِ کارواں رہے

ہم بے بسی کے فیض سے دریائے شوق میں — تنکے کی طرح موج کے بل پر رواں رہے

اچھا! جناب عشق ہیں؟ تشریف لائیے!!! — خوب آئے آپ! آئیے حضرت!! کہاں رہے

وہ اور ہمارے پاس! خدا ساز بات تھی — ہم تو تو خدا کی قسم بدگماں رہے

صاحب ہماری توبہ ہمیں باز آ گئے — ہاں ہاں کے بعد پھر بھی نہیں پر تو ہاں رہے

تھے حق شناس اور انا الحق نہ کہہ سکے — اہلِ زباں تھے ہم بھی مگر بے زباں رہے

سر سیکڑوں جہاں میں سروں کی کمی نہیں — اُس آستاں کی خیر ہو وہ آستاں رہے

دیکھیں کسی کی قبر بھی رہتی ہے یا نہیں — ہر اک یہ چاہتا ہے کہ میرا نشاں رہے

پھر بھی رواں ہے جانبِ ساحل جہازِ عمر — لنگر رہا کوئی نہ کوئی بادباں رہے

گزرے ہوئے شباب کے قصّے نہ چھیڑیے — وہ ہم نہیں رہے تو بھلا تم کہاں رہے

دیکھا تو اک مرض تھی یہ مستیٔ حفیظ

جس طرح کوئی خواب میں اُٹھ کر رواں رہے

تمام شد

کتبہ صفدر علی